جنونِ ماٸل

نادیہ احمد

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جنوں مائل



نادیہ احمد



جنوں مائل

کتابی شکل : پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام





سرخ گلابوں سے سجا کشادہ کمرہ بہار کا منظر پیش کر رہا تھا۔کمرے کے وسط میں رکھے جہازی بیڈ پہ بچھے قیمتی مخملی بیڈ کور پہ اس کے پہلو بدلنے سے پڑنے والی شکنیں دل کے اندر مچی ہلچل کی غماز تھیں۔وسط گرما کے باوجود کمرے میں ائیر کنڈیشن کی ٹھنڈک اس کی مہندی رچی نازک اور مخروطی انگلیوں میں اترتی انہیں یخ بستہ کر رہی تھی۔کچھ پھولوں کی بھینی مہک، کچھ اے سی کی سرد ہوا۔۔۔اس پہ نئی زندگی کا خمار، آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں لیکن دروازے کی ناب گھمانے کی آواز کانوں تک پہنچی تو وہ ایکدم چوکس ہوکر بیٹھ گئی۔آنے والے کے قدموں کی چاپ دل کی دھڑکن تیز کررہی تھی۔اپنی بھیگی ہتھیلیوں کو مسلتے وہ پلکیں

جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔اس کے بالکل پاس پہنچ کر قدم ٹھہر گئے۔وہ تھوڑا اور محتاط ہوئی۔

۔" ضوفشاں"۔سرخ لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ سجائے اس نے پلکیں اٹھائیں۔

''یہ میرا بیٹا ہے"۔اپنے پاس کھڑے نوعمر سرخ و سفید بچے کا ہاتھ تھپتھپاتے وہ مزید بولا۔

''اور آج سے یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔یوں سمجھو میری طرف سے تمہارے لئے یہ ہماری شادی کا تحفہ ہے"۔اس نے تحیر سے اپنی رونمائی کے تحفے کی جانب دیکھا۔بچہ پرشوق نظروں پر سنجیدہ تاثرات لئے اسی کو دیکھ رہا تھا۔سینے سے ایک گہری سانس نکلی پر اگلے ہی پل لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوکر آنکھوں تک پہنچی۔محبت سے ہاتھ بڑھا کر اس نے بچے کو اپنی جانب کھینچا۔وہ بلا اعتراض پاس چلا آیا۔"آپ بے فکر رہیں یہ آج سے میرا بیٹا ہے اور میری ذمہ داری ہے۔"کیا خوب شبِ عروسی تھی اور کیا ہی شاندار رونمائی تھی۔

شفقت سے اس کا ماتھا چومتے وہ شیریں لہجے میں بولی۔

☆☆☆

دھند کے پردے میں چھپا سورج کا تھال دولہن سا شرمایا اپنی چھب دکھلا کر بادلوں کی اوٹ میں جاچکا تھا۔شہر اور اس کے گرد و نواح میں پچھلے دو دن سے شدید دھند چھائی تھی ، رات کو اکثر درجہ حرارت نقطہِ انجماد کو چھو لیتا تھا۔سہ پہر تک اندھیرا چھا جاتا، چہار سو خاموشی ڈیرے ڈال لیتی تھی۔تین ساڑھے تین بجے دھند زمین کا رخ کرنے لگتی اور اس کے ساتھ سڑکوں پہ ٹریفک بتدریج کم ہوتی جاتی، گلیاں ویران ہوجاتیں۔ رگوں میں لہو جماتی سردی نے کاروبارِ دنیا کو بری طرح متاثر کرر کھا تھا۔ آج بھی صبح سے ہر طرف خاموشی چھائی تھی ماسوائے سکندر ولا کے۔۔۔جہاں اوپری منزل کے ایک کمرے میں طوفان مچا ہوا تھا۔ یہاں سے وہاں بھاگتی، سر کھجاتی، ناک منہ چڑھاتی وہ کبھی درازیں کھنگال رہی تھی تو کبھی الماریوں کے دروازے بج رہے تھے۔چہرے پہ شدید ہونق پن تھا۔آنکھوں میں بلا کی بیزاری تھی۔

۔"بھئی میں پوچھتا ہوں اس کمرے میں اتنا اودھم کیوں مچار کھا ہے؟"سکندر حسین نے دروازے کی اوٹ سے منہ نکالا۔

''ایسا لگتا ہے دشمن نے مورچوں میں گھس کر اینٹ سے اینٹ بجا دی ہو۔آخر پتا تو چلے یہ شب خون کس بناء پر مارا گیا"۔کمرہ بری طرح بکھرا ہوا تھا۔وہ بلا تعامل اندر چلے آئے اور داخل ہوتے ہی سوال داغا۔

''بابا ہٹ جائیں پلیز مجھے جانا ہے"۔الماری سے کپڑے نکالتے اس نے احتجاج کیا۔

''کیا مطلب جانا ہے۔میں تو سمجھا تم پہ ہفتہِ صفائی منانے کا جنون سوار ہوا ہے جو سارا سامان الماریوں سے نکال کر پھینکا ہوا ہے"۔سکندر حسین متعجب ہوئے۔بیڈ پہ آٹھ دس جوڑے بمعہ ہینگر موجود تھے پاس ہی ایک چھوٹا سا سفری بیگ اور اس کا ہینڈ بیگ کھلا ہوا تھا جس میں چیزیں بے ترتیبی سے ٹھونسی گئی تھیں۔

''رابیل یہ تمہارا سوٹ استری ہوگیا"۔مزینہ بے جھجک کمرے میں داخل ہوئی اور ایک تہہ شدہ جوڑا اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے فٹا

فٹ بیگ میں ڈال لیا۔مزینہ بھی اس کی مدد کرنے لگی۔وہ دونوں ہی ان کی موجودگی کو نظر انداز کر رہی تھیں۔

''تھینکس آپی''۔سیاہ پرنٹڈ شارٹ شرٹ اور آف وائٹ ٹراؤزر پہ سیاہ سوئیٹر پہنے وہ تقریباََ تیار تھی۔شولڈر کٹ بھورے بالوں کو کیچر میں جکڑ رکھا تھا پر چند آوارہ لٹیں اس بھاگ دوڑ میں دودھیا گالوں کو چھو جاتی تھیں۔میک اپ کے نام پہ فقط ایک سرخ لپ اسٹک تھی جس نے ہونٹوں کو سجا رکھا تھا۔صورت شکل کے اعتبار سے وہ نارمل تھی پر اس کا دراز قد، متناسب جسامت اور اس کا اسٹائل توجہ بٹورتا تھا۔

''تو کیا تم نے سچ میں گھر چھوڑنے کا ارادہ کرلیا ہے۔جانے سے پہلے کم سے کم باپ کو تو بتادو''۔مارے تجسس ان کا حال خراب ہورہا تھا۔

''بابا''۔وہ پلٹی اور دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کر آنکھیں گھمائیں۔

''اچھا اچھا۔۔ٹھیک ہے۔میں سمجھ سکتا ہوں۔وعدہ نہیں کرتا لیکن ہائی کمانڈ سے بات کروں گا۔میری طرح تمہیں بھی کسی کونے میں سر

چھپانے کی جگہ مل جائے گی"۔وہ باقاعدہ ہار ماننے والے انداز میں بولے ، چہرے پہ بلا کی سنجیدگی تھی۔

''بابا میں ہوسپٹل جارہی ہوں"۔رابیل نے دایاں ہاتھ سر پہ مارتے بلند آواز میں کہا۔

''اچھا تو وہ رکھ لیتے ہیں گھر بدر ہونے والے ڈاکٹروں کو"۔وہ اب بھی نہایت سنجیدہ تھے پر آنکھوں میں شرارت چغلی کھا رہی تھی۔

''بابا رابیل کی ڈیوٹی ہے چھتیس گھنٹے کی۔آج جائے گی پرسوں واپس آجائے گی"۔رابیل زچ ہوئی جبکہ مزینہ نے وضاحت کی۔

''لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔چھتیس گھنٹے کی ڈیوٹی کے لئے یہ سب ساتھ لے جارہی ہو۔کیا ہسپتال میں ڈاکٹری نہیں چل رہی جو عورتوں کا جمعہ بازار کھولنے کا سائیڈ بزنس پلان کررہی ہو۔"ہاتھ پہ ہاتھ مارتے وہ قریبی صوفہ پہ براجمان ہوگئے۔

''جی نہیں۔۔۔ایسی کوئی بات نہیں۔بس کپڑے سیلیکٹ کر رہی تھی۔کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا کون سے لے کر جاؤں''۔رابیل نے منہ بناتے بیڈ پہ بکھرا پلندہ الٹ پلٹ کیا۔وہ اب تک کنفیوز تھی۔

''اسی لئے میں تمہارے ڈاکٹر بننے کے خلاف تھا۔یہاں کپڑے سیلیکٹ کرنے میں الجھی ہو وہاں مریضوں کو دوا دینے پہ اٹک جاتی ہو گی۔گلابی ٹیبلیٹ کے ساتھ سفید نہیں سبز کیپسول کا کمبینیشین بنے گا۔۔۔سرخ شربت کے ساتھ نیلا کیپسول دیا جائے یا نہیں''۔اپنی ایسی ہی باتوں کی بدولت وہ اچھے خاصے سنجیدہ ماحول میں ہنسی کے رنگ بکھیرنے کی قدرت رکھتے تھے۔اس گھر میں رابیل کے بعد سب سے زیادہ شور مچانے والوں میں سکندر حسین کا نام سرِ فہرست تھا۔بقول ان کی بیگم اس گھر پہ چڑیا گھر کا گمان ہوتا ہے اور ان دونوں کی موجودگی میں گھر سے خاموشی اور سنجیدگی بناء اجازت واک آؤٹ کر جاتی تھی۔

''تو آج پھر تمہاری سواری روانگی کو تیار ہے؟'' شگفتہ کی آمد نے رابیل اور مزینہ کو چوکس کیا تھا۔ماتھے پہ بل ڈالے انہوں نے سوال کیا تو رابیل نے نچلا لب کاٹا۔

''ممی میری ڈیوٹی ہے''۔نظریں جھکائے اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''وہ تو روز ہوتی ہے۔اسپتال میں بس لے دے کر ایک تم ہی فارغ ہو جو آئے دن تمہارا بلاوہ رہتا ہے''۔ان کا انداز استہزائیہ تھا۔ رابیل نے نظریں نہیں اٹھائیں۔

''بیگم صاحبہ آپ کی بیٹی ڈاکٹر ہے وہ بھی نہایت مشکل سے۔اور یہ ثابت کرنے کے لئے اسے ہسپتال میں حاضری لگوانی پڑتی ہے''۔ سکندر حسین نے بر وقت مداخلت کی وہ ان تمام موقعوں پہ بیٹیوں کی د فاعی ڈھال ہوتے تھے جب ان کی بیگم کا پارہ چڑھا ہوتا تھا۔

''یہ کپڑے کیوں پھیلا رکھے ہیں؟''ان کی بات کو یکسر نظر انداز کرکے وہ اب بھی اسی سے مخاطب تھیں۔

''ممی میں سمیٹ دیتی ہوں''۔مزینہ نے جلدی جلدی ہینگر اٹھانا شروع کئے۔

''کوئی ضرورت نہیں ، یہ رابیل کا کمرہ ہے اور اس کی ذمہ داری ہے اپنا پھیلاوہ اٹھائے۔تم چلو میرے ساتھ کچن میں کام ہے''۔حکمیہ لہجے میں کہتیں وہ کمرے سے نکل گئیں۔ان کی ناراضی کے خوف سے مزینہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔جانے سے پہلے اس نے ان دونوں کو دیکھا اور کندھے اچکا کر اپنی مجبوری ظاہر کی تھی۔

''ہائی کمانڈ کی سرخ بتی (خطرے کا نشان) جل چکی ہے''۔صوفے پہ بیٹھے سکندر حسین نے آنکھ سے اشارہ کیا۔

''وہ تو ہر وقت ہی جلتی رہتی ہے''۔وہ پیر پٹختی بیڈ پہ جا بیٹھی۔

''چلو چلو ہم دونوں مل کر یہ کمرہ ٹھیک کر دیتے ہیں ورنہ وہ پھر آگئیں تو گولہ باری شروع ہوجائے گی''۔اس کا اترا چہرہ تو انہیں بالکل پسند نہیں تھا۔اب وہ دونوں مل کر کمرے کی چیزیں واپس رکھ رہے تھے۔

''کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے میں ان کی سگی اولاد نہیں ہوں۔۔۔بالکل سوتیلوں والا سلوک کرتی ہیں مجھ سے''۔اپنا اسٹیتھو اسکوپ بیگ میں ٹھونستے رابیل نے منہ بنایا۔

''ہائے کچھ ایسا ہی غم مجھے بھی ہے چندا۔آج تک کبھی سگے شوہر والا سلوک نہیں کیا مجھ سے ہمیشہ سوتیلا برتاؤ کیا ہے تمہاری ماں نے''۔ کمرہ اب پہلے والی حالت میں واپس آچکا تھا اور اس کے ساتھ ان کا موڈ بھی۔گردن کے پیچھے ہاتھ باندھتے ہوئے انہوں نے انتہائی درد بھرے انداز میں کہا کہ رابیل کا خراب موڈ دم دبا کر بھاگ گیا۔وہ بے اختیار ہنسی تھی۔

☆☆☆

شہر کے پوش علاقے میں وسیع سبزہ زار میں گھری قیمتی پتھر اور شیشوں سے تعمیر شدہ یہ عمارت سر کے تاج سی شان و شوکت اور آن بان سے کھڑی تھی۔''آشیانہ'' کی اوپری منزل پہ بنے ماسٹر بیڈروم کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے اس نے خود پہ ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔سلور ٹائی

کی ناٹ درست کر کے ڈریسنگ ٹیبل پہ پڑی کلون کی بوتل سے خود پہ چھڑکاؤ کیا۔سیاہ جیکٹ کا بٹن لگا کر اپنے نم بالوں میں انگلیاں چلاتے ان کی ترتیب درست کرتا وہ اب اپنا موبائل فون چیک کر رہا تھا جہاں بے شمار مسڈ کالز اور میسیجز بلنک کر رہے تھے۔ایک ہاتھ سے لیپ ٹاپ بیگ اٹھائے دوسرے ہاتھ سے موبائل اسکرین اسکرول کرتا وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا۔لاؤنج میں ملازم اسے دیکھ کر مستعد ہوا اور ڈائیننگ ٹیبل کی طرف بڑھا لیکن اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور سیل فون کان سے لگا لیا۔یہ اس بات کی وعید تھی وہ آج ناشتہ نہیں کرے گا۔تیز قدموں سے چلتا وہ ڈرائیو وے تک آیا۔سفید لگژری کار کے پاس کھڑے ڈرائیور نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا ، اس کا بیگ تھاما اور پچھلا دروازہ کھولا۔کال مل چکی تھی وہ اب سیل فون پہ بات کر رہا تھا۔سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا گیا تھا۔گھر سے دفتر تک کے سفر کا آغاز ہوا اور اس کے ساتھ فون پہ کالز کا تانتا بندھ گیا۔ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری کال اٹینڈ کرتے وہ ساتھ ساتھ میسیجز کے جوابات بھی دے رہا تھا۔تمام

کالز کاروباری نوعیت کی تھیں۔ڈرائیور محتاط انداز میں ڈرائیو کر رہا تھا۔وہ اس کے معمول سے باخبر تھا۔گاڑی مناسب رفتار میں سڑک پہ دوڑتی لمحہ بالمحہ اپنی منزل تک پہنچ رہی تھی کہ اچانک ایک ٹرالر کو اوور ٹیک کرنے کی کوشش میں اسٹیئرنگ پھسلا۔

''گل خان دیکھ کے''۔تمام دھیان فون پہ ہونے کے باوجود وہ پوری طرح چوکس تھا پر شاید بہت دیر ہوچکی تھی۔تیز رفتار ٹرالر ، گاڑی کے اگلے حصے سے بری طرح ٹکرایا تھا۔گاڑی بے قابو ہوکر سڑک پہ قلابازیاں لگاتی آنِ واحد میں سڑک کے دوسری جانب الٹی پڑی تھی۔ اس کا اگلا حصہ بری طرح اڑ گیا تھا۔

☆☆☆

سکندر ولا کے لاؤنج کی بتیاں روشن تھیں اور حسبِ معمول شگفتہ بیگم کا موڈ بری طرح آف تھا۔موضوعِ گفتگو بس ایک تھا اور ہمیشہ کی طرح ان کی بات کو سکندر حسین نے ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

''یہ فقط آپ کی دی ہوئی ڈھیل ہے جو یہ لڑکی مجھے تو کسی گنتی میں ہی نہیں لکھتی''۔رابیل کے نکلتے ہی شکوے شروع ہو گئے تھے۔

''بیگم صاحبہ گنتی تو آپ سے آگے پہنچی ہی نہیں، ہائے دل کے ارماں دل میں ہی رہ گئے ظالم''۔مزینہ کی ہنسی نکل گئی۔

''سکندر حسین میں انتہائی سنجیدہ ہوں''۔شگفتہ کے گھور کر دیکھنے پہ وہ ایکدم سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئی اور کن انکھیوں سے بابا کی سمت دیکھا جن کے چہرے پہ اب بھی شرارت عروج پہ تھی۔

''لیکن اب ایسی باتوں پہ سنجیدہ ہونے کا کیا فائدہ ، وہ دن تو بیت گئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے''۔وہ بے جا اپنا سر کھپا رہی تھیں اتنا تو جانتی تھیں۔سکندر حسین چکنے گھڑے تھے کم ہی ان سے سنبھلتے تھے۔

''پرسوں سالگرہ ہے رابیل کی اوغالباََ یہ پروگرام بھی آپ کا ہی طے کردہ تھا کہ اسے سرپرائز پارٹی دی جائے گی''۔انہوں نے یاد دہانی کرائی۔

''ہاں تو ہم کہاں مکر رہے ہیں۔پارٹی ہوگی اور بالکل ہوگی۔کیوں بھئی مزینہ''۔سکندر صاحب نے پاس بیٹھی مزینہ کو مخاطب کیا۔

''جی بابا، میں نے اور شجاع نے سب انتظامات کر لئے ہیں''۔فلور کشن پہ بیٹھی مزینہ نے تفصیلات بتائیں۔

''میرا خیال ہے سالگرہ کی تقریب میں اس شخص کی شمولیت بھی ضروری ہوتی ہے جس کی سالگرہ ہو۔یا پھر آپ دونوں باپ بیٹی اس کا بھی کوئی شاندار حل نکال چکے ہیں۔کیک کی تصویر اس کو واٹس ایپ کردی جائے گی اورجواباً وہ اس پہ الیکٹرانک چھری چلا کر آپ کو ارسال کردیں گی''۔شگفتہ نے طنز کیا۔

''بھئی واہ واہ، سائنس کی ترقی نے آپ کے دماغ کو بھی چلا ہی دیا۔کیا زریں طریقہ بتایا ہے۔بہت اعلیٰ۔''۔سکندر حسین نے داد دی۔

''ماما رابیل دوپہر تک واپس آجائے گی ، کہہ کر گئی ہے۔آپ کیوں پریشان ہورہی ہیں''۔مزینہ بیچاری ان موقعوں پر ہمیشہ پستی تھی۔ اس نے اپنے تیئں تسلی دی پر شگفتہ کا موڈ ہنوز خراب تھا۔

''مجھے تم سب چین سے بیٹھنے دیتے ہی کب ہو۔ایک سے بڑھ کر ایک نمونہ ہے اس گھر میں اور باقی کی کسر یہ پوری کر دیتے ہیں اپنی اولاد کے ساتھ مل کر۔پھر کہتے ہیں پریشان مت ہو''۔وہ نروٹھے پن سے کہتیں پیر پٹختیں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

''بھئی مزینہ، آج یقیناً بارش و ژالہ باری ہوگی''۔سکندر حسین نے ان کے جاتے ہی تبصرہ کیا۔

''لیکن بابا بادل تو دکھائی نہیں دے رہے''۔مزینہ نے بیٹھے بیٹھے کھڑکی سے باہر جھانکا۔

''اچھا کمال ہے، پر اندر تو گرج چمک ہو رہی ہے''۔کمرے کے بند دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے وہ بولے تو مزینہ ہنسی۔

''بابا آپ کیوں ہر وقت ماما کو تنگ کرتے رہتے ہیں''۔مزینہ کی بات پر سکندر صاحب نے قہقہہ لگایا۔

''یار یہ اس عمر میں ہم بڈھوں کے رومانس کا ایک انداز ہے۔تم ٹینشن مت لیا کرو''۔کیا خوب وضاحت دی گئی تھی۔

’’اچھا تو پھر جائیں انہیں منائیں وہ ناراض ہوگئی ہیں‘‘۔

’’لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔یعنی میں شیر کی کچھار میں اکیلا اتر جاؤں۔ نہ بابا نہ، زندگی بہت قیمتی شے ہے اور میں بھرے بڑھاپے میں شہید نہیں ہونا چاہتا‘‘۔انہوں نے باقاعدہ دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

’’یوں کرو، تم بھی ساتھ آجاؤ مل کر مناتے ہیں تمہاری ماما کو، کیا خیال ہے‘‘۔سر ہلاتی مزینہ ان کے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی تھی۔

شہر کے پوش علاقے میں بنی اس نئی کالونی میں چھوٹے کوٹھی نما گھر جو باہر اور اندر سےتقریباََ ایک ہی جیسے تھے۔فرق تھا تو بس مکینوں کا، ان کی عادات کا، طرزِ زندگی کا۔حاصل کی دوڑ میں الجھے حال سے بے حال ہورہے ہجوم سے ہٹ کر بھی ابھی چند لوگ تھے جو زندگی کو زندگی کی طرح جیتے تھے۔جن کے قہقہے مصنوعی نہیں تھے۔جہاں خلوص کی مٹی میں گندھے رشتے سکون کا باعث تھے۔کل چار نفوس پہ مشتمل یہ چھوٹا سا گھر قہقہوں سے گونجتا یہاں کے مکینوں کی زندہ دلی کی شاندار مثال تھا۔ یہاں دولت کی چاہ سے بڑھ کر رشتوں کی محبت تھی جو دلوں میں

ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔سکندر حسین ریٹائرڈ پروفیسر تھے اور شگفتہ خاتونِ خانہ، کسی زمانے میں وہ بھی کالج میں لیکچرار رہ چکی تھیں لیکن پھر گھریلو ذمہ داریوں اور بچوں کی وجہ سے انہوں نے ریزائن کر دیا تھا۔گھر کا ماحول تعلیمی تھا اور دونوں بیٹیاں نہایت ذہین۔مزینہ تو ماسٹرز کے بعد گھر پہ ہی تھی کیونکہ اسے ملازمت میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی دوسرے گریجویشن میں ہی اس کا نکاح اس کے ماموں زاد شجاع سے ہو چکا تھا۔رابیل کو ڈاکٹر بننا تھا۔سکندر حسین اور شگفتہ دونوں ہی اس بات کے حق میں نہیں تھے کیونکہ میڈیسن جیسی مشکل اور سنجیدہ پڑھائی رابیل کے مزاج سے یکسر مختلف تھی۔وہ انتہائی غیر سنجیدہ، بے حد باتونی اور سب سے بڑھ کر غیر ذمہ دار تھی جس پہ اکثر اس کی ممی سے کھنچائی ہوتی رہتی تھی۔مگر حیرت انگیز طور پہ وہ اپنے مزاج کے برعکس اپنی پڑھائی اور پروفیشن دونوں میں بے حد سنجیدہ تھی۔مقامی اسپتال سے اپنی ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد وہ اب اسی اسپتال کے شعبہِ حادثات میں کام کر رہی تھی۔پچھلے دنوں دو ڈاکٹروں کی سالانہ چھٹیوں کی وجہ

سے آج کل آن ڈیوٹی ڈاکٹروں پہ کام کا بوجھ زیادہ تھا اسی لئے اس کا گھر سے زیادہ وقت اسپتال میں گزر رہا تھا۔شگفتہ کی ناراضی کی وجہ بھی اس کا ضرورت سے زیادہ خود کو پریشر میں رکھ کر کام کرنا تھا اور ان دنوں وہ اس سے خفا تھیں جس کا اظہار وہ اپنے مخصوص انداز میں کرتی رہتی تھیں۔سکندر حسین اس کے سب سے بڑے حامی تھے کیونکہ وہ ان کے بے حد لاڈلی تھی۔سکندر حسین اور مزینہ کی دفاعی شیلڈ نہ ہوتی تو یقیناً شگفتہ کی باتیں اسے تھوڑا بہت بدل دیتیں لیکن وہ دونوں وفاداری کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ان کے عتاب سے بچا لیا کرتے تھے۔

☆☆☆

اسپتال میں معمول کی گہما گہمی تھی لیکن شعبۂ حادثات کی طرف سناٹا چھایا ہوا تھا ایسے میں اس کی ہیل کی ٹک ٹک سے پیدا ہونے والا شور فضا میں گونج رہا تھا۔وہی دوپہر والے لباس پہ سفید اوور آل پہنے ، گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے وہ پوری طرح چاق و چوبند تھی۔بال اب

بھی کیچڑ میں لپٹے تھے اور بھوری لٹیں کچھ اور پریشان نظر آرہی تھیں۔ کانوں میں دمکتے زرقون کے ٹاپس جو اس کے جسم پہ واحد زیور تھا اور اس کے چہرے پہ سج رہا تھا۔

''ڈاکٹر رابیل رنگ روڈ ایکسیڈنٹ کیس کو آپ اٹینڈ کر رہی ہیں''؟ ایمر جنسی انچارج، ڈاکٹر شفقت کیانی کے تیز قدموں سے قدم ملاتے وہ ان کے ہمراہ ایمر جنسی روم کی طرف بڑھی۔ہاتھ میں پکڑی فائل پہ نگاہ ڈالتے انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں سوال کیا۔

''جی سر میں اور ڈاکٹر عاصم۔۔۔ہم دونوں کی ڈیوٹی ہے ایمر جنسی میں''۔چلتے چلتے وہ دونوں کیس بھی ڈسکس کر رہے تھے۔

''تو کیا اپ ڈیٹ ہے''؟ ڈاکٹر کیانی نے سوال کیا۔

''ڈرائیور کی تو آن دی سپاٹ ڈیتھ ہوگئی تھی۔اس کی ڈیڈ باڈی ہم نے اس کے لواحقین کو ضروری کاروائی کے بعد ہینڈ اوور کر دی''عادتاً نچلا لب دباتے اس نے تفصیلات بتانا شروع کیں۔

''ویری سیڈ، اور وہ دوسرا مریض؟'' ڈاکٹر کیانی نے مزید پوچھا۔

"He was uncautious with minor injuries" ۔(وہ بیہوش تھا معمولی زخموں کے ساتھ)

"فوری طبی امداد کے بعد وہ stable ہے۔ہوش میں آجائے تو آئی تھنک اسے روم میں شفٹ کیا جاسکتا ہے"۔وہ دونوں پیشہ ورانہ انداز میں باتیں کرتے ایمرجنسی روم تک پہنچ چکے تھے۔

"کچھ پتا چلا کون ہے وہ ، اس کے ورثاء کو اطلاع دی؟"ڈاکٹر کیانی نے مزید پوچھا۔

"سر کوئی اذلان شاہ ہے۔۔انتظامیہ نے اس کی فیملی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ شائد ملک میں نہیں۔باقی اس کا اسٹاف ہے یہاں"۔ایمرجنسی روم کا دروازہ کھولتے رابیل نے ان تک معلومات پہنچائی۔

"کیا ٹریٹمنٹ دیاہے آپ نے انہیں؟"وہ دونوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔وسیع کمرے میں کل چار بیڈ لگے تھے جنہیں پردوں کی مدد سے الگ کیا گیا تھا۔ایک پردہ ہٹا کر وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

''سر یہ فائل میں ڈیٹیل ہیں ساری''۔بستر پہ لیٹے مریض پہ نگاہ ڈالتے اس نے بتایا۔وہ اس وقت ہوش میں تھا۔ایکسیڈنٹ کی نوعیت شدید تھی جس میں ڈرائیور بری طرح زخمی ہوا تھا۔اسے بچایا نہیں جاسکا ۔خوش قسمتی سے وہ خود بہت زیادہ زخمی نہیں ہوا تھا۔پھر بھی جسم اور چہرے پہ کئی چوٹیں آئیں تھیں۔بیہوشی کے باعث اسے ڈرپ لگائی ہوئی تھی۔

''ہیلو مسٹر ازلان۔۔۔میرا نام ڈاکٹر شفقت کیانی ہے اور یہ ڈاکٹر رابیل ہیں۔''ڈاکٹر نے اس بار اسے مخاطب کیا تھا۔

''کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟ ویسے آپ بہت خوش قسمت ہیں جو اتنے خطرناک حادثے میں سروائیو کر گئے ہیں''۔وہ خاموش تھا۔ڈاکٹر نے مزید پوچھتے بشاش لہجے میں کہا۔

''خوش قسمت؟'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔چہرہ بے تاثر تھا۔

''اسٹاف بی پی چیک کریں''۔پاس کھڑی ڈیوٹی نرس کو ہدایت دی گئی تھی۔نرس نے بلڈ پریشر چیک کرنے کا آلہ درست کرتے اس کا بازو تھاما۔اس کے خاموش وجود میں حرکت ہوئی تھی۔

''اسٹاپ۔۔۔ڈونٹ ٹچ می''۔وتقریباََ دھاڑا تھا۔

''مسٹر شاہ وہ آپ کا بی پی چیک کریں گیں''۔ڈاکٹر کیانی نے نرمی سے سمجھایا پر اس کے چہرے پہ وحشت تھی۔ڈاکٹر کے اشارے پہ نرس نے ایک بار پھر اس کا بازو تھامنے کی کوشش کی۔

''میں نے کہا خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ لگایا۔''وہ شدید مشتعل تھا۔احتجاج اتنا شدید تھا کہ نرس اور ڈاکٹر دونوں ہی ششدر تھے۔آنکھوں میں شدید غصہ تھا جس کا اظہار اس نے ہاتھ پہ لگا کینولا کھینچتے ہوئے کیا۔بیدردی سے سوئی نکالتے خون کے ننھے قطرے ہاتھ کے بیرونی حصے پہ نمودار ہوئے تھے۔

''انف!''رابیل نے ایکدم آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔وہ ایک مضبوط توانا مرد تھا اس نے بازو چھڑانے کی کوشش کی جس سے

رابیل کو شدید جھٹکا لگا اور کوٹ کی جیب میں اٹکا اس کا فاؤنٹین پین ٹائل فلور پہ گر کر دو ٹکڑے ہوگیا مگر رابیل نے اس کی کلائی نہیں چھوڑی تھی۔

''چپ''۔اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کوئی چھوٹے بچے کو ڈپٹتا ہے۔وہ بے یقینی سے اس نوجوان ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا جو بے حد سنجیدہ اور تنبیہی نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

''اسٹاف آپ بی پی چیک کریں''۔نرس کو حکم دیتے وہ خود روئی سے ہاتھ پہ لگا خون صاف کرتے اب اس کا کینولا دوبارہ لگا رہی تھی۔وہ بغور اسی کو دیکھ رہا تھا پر احتجاج دم توڑ چکا تھا۔سر تکیے پہ گراتے وہ اب مشتعل نہیں مگر بے چین تھا۔رابیل نے جھک کر اپنے قلم کے دو نوں ٹکڑے اٹھائے۔اس کے چہرے پہ تاسف تھا سر جھٹکتے اس نے ایک نظر اس عجیب مریض کو دیکھا اور قلم کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔چند منٹ اس کی طبیعت، دواؤں اور طریقہ علاج پہ تبادلہ خیال کرنے کے بعد وہ دونوں وہاں سے دوسرے مریض کے پاس چلے گئے تھے۔بستر پہ لیٹے

اذلان کا سر مسکن دواؤں کی وجہ سے بھاری ہورہا تھا۔اس نے آنکھیں موند لیں، چند منٹ میں وہ گہری نیند سو چکا تھا۔

☆☆☆

رابیل اسٹاف روم میں اکیلی بیٹھی اپنے ڈنر سے لطف اندوز ہورہی تھی جب ڈاکٹر عاصم ہاتھ میں چائے کے دو مگ تھامے اندر داخل ہوا۔اسے مزے سے پیزا اڑاتا دیکھ کر ماتھے پہ تیوریاں چڑھائیں اور پھر چائے کا مگ میز پہ پٹخنے کے سے انداز میں رکھا گیا تھا۔

''میں تو سمجھا تھا آپ سوگ منا رہی ہوں گی پر لگتا آپ پہ ہر بات کا الٹا اثر ہوتا ہے''۔وہ طنزیہ بولا تو رابیل نے باقاعدہ گھورا۔

''ایکسکیوز می، سوگ منائیں میرے دشمن''۔جوابی وار کے بعد وہ ایک بار پھر اپنے کھانے میں مصروف ہوگئی تھی۔

''دشمن ہوں گے تو سوگ منائیں گے نا، آپ سے بچ کر بیچاروں کے پاس اس دنیا میں تو کوئی جگہ نہیں۔سب مریخ پہ شفٹ ہورہے

ہیں“۔چائے کا گھونٹ بھرتے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے ڈاکٹر عاصم نے جتانے والے انداز میں کہا۔

”یہ آپ میری برائی کر رہے ہیں؟“اس نے ابرو اچکائے۔

”مجھے ابھی اپنی نوکری اور زندگی دونوں عزیز ہیں لہذا یہ گستاخی مجھ سے سرزد نہیں ہو سکتی۔اچھا خیر چھوڑیں۔۔سننے میں آیا آپ کا وہ سنہری قلم اس دارِفانی سے کوچ کر گیا ہے“۔کانوں کو ہاتھ لگاتے اس نے وضاحت کی اور اصل مدعا کی طرف آیا۔یقیناً ڈیوٹی نرس کی بدولت ایمر جنسی کا واقعہ اس تک پہنچا تھا۔

”ٹھیک سنا ہے آپ نے“۔رابیل نے لب بھینچے۔اس کے چہرے پہ تاسف در آیا تھا۔

”بہت افسوس ہوا۔یقیناً نہایت نایاب قلم ہو گا جسے آپ یوں ہر پل دل سے لگا کر رکھتی تھیں۔فرعون کے زمانے کا تو ہو گا؟“ ڈاکٹر عاصم اس کا بیچ میٹ تھا۔دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی کالج سے ایم بی بی ایس کیا تھا اور ہاؤس جاب کے بعد دونوں ملازمت بھی ایک ہی اسپتال

اور ایک ڈیپارٹمنٹ میں کر رہے تھے۔عاصم کی بذلہ سنج طبیعت اور رابیل کی شرارتی شخصیت کی بدولت دونوں میں اچھی دوستی تھی۔ڈاکٹر عاصم سے اس کی اتنی پرانی دوستی تھی کہ اس کی فیملی اسے گھر کا فرد ہی سمجھتی تھی۔

''بابا نے گفٹ کیا تھا مجھے ایم بی بی ایس میں ایڈمیشن کے بعد''۔رابیل کو اپنے پین سے شدید محبت تھی۔پچھلے کئی سال سے وہ پین اس کے پاس تھا اور بہت بار مذاق کا نشانہ بننے کے باوجود اس نے اس کا استعمال ترک نہ کیا تھا۔وہ بہت مہنگا نہیں پر بہت خاص تھا کیونکہ اس کے پیارے بابا کا تحفہ تھا اور وہ اسے ہمیشہ بہت سنبھال کے رکھتی تھی جو آج ایک مریض کے ہنگامے کو ہینڈل کرنے میں اس کے کوٹ سے گر کر ٹوٹ چکا تھا۔

''ایک منٹ میں ٹوٹ گیا''۔اس نے تاسف سے کہا۔

''تو پھر آپ نے اس کی ہڈیاں نہیں توڑیں''۔ڈاکٹر عاصم نے اسے چھیڑا۔

''کس کی؟''اس نے ناک چڑھائی۔

''جس نے قلم توڑا''۔انداز استہزائیہ تھا۔

''وہ تو پتا نہیں عجیب ہی چیز ہے۔ذرا سی بات پہ ایمر جنسی میں واویلا مچا دیا اس نے۔میرا خیال ہے وہ شاک میں تھا''۔وہ یکدم سنجیدہ ہوئی تھی۔آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرایا تھا جب چہرے پہ جنون اور پھولے تنفس کے ساتھ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''یقیناً ہو گا، آپ جیسی تیس مار خاں کی گھوریوں کے بعد کوئی بھی نارمل انسان شاک کی کیفیت میں جاسکتا ہے''۔ڈاکٹر عاصم نے حسبِ معمول جملہ کسا جس پہ رابیل نے مصنوعی خفگی سے دیکھا پھر چائے کا مگ اٹھا کر مزے سے گھونٹ بھرنے لگی۔

☆☆☆

قیمتی پتھروں سے تعمیر کردہ پرانی طرز کی عمارت مکینوں کی شان و شکوہ اور حسب نسب کی چغلی کھاتی تھی۔بلند دروازے کے ستونوں پہ لگی تختی پہ عمارت کا نام کندہ تھا۔''گلفشاں''۔۔۔لمبی چوڑی ڈرائیو وے کے

بعد محل نما کوٹھی دکھائی دیتی تھی جسے دو اطراف سے خوبصورت اور وسیع لان نے گھیر رکھا تھا۔عمارت کے پچھلی جانب مصنوعی جھیل بنائی گئی تھی۔دھوپ میں اس کے پانی سنہری ہوتے تھے۔شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔سورج کی کرنیں ابھی کچھ دیر پہلے گلفشاں پہ اپنی آخری نگاہ ڈالتی رخصت ہوتیں جھیل کے سونے رنگ کو سیاہ کر گئی تھیں۔عمارت کے بیرونی حصے کی زرد مدہم روشنیاں جل چکی تھیں جبکہ اندرونی حصہ قیمتی فینسی لائٹوں اور کرسٹل جھومر کی چکاچوند روشنیوں سے منور تھا۔اپنے ہمسفر کا بازو تھامے وہ سرشار سی اپنے کمرے سے باہر نکلی۔سنہری کامدار ساڑھی میں اس کا دلکش سراپا ستم ڈھا رہا تھا۔گلے کے گہرے کاٹ سے نمایاں ہوتی گردن کی ہڈی اور تنی ہوئی صراحی دار گردن میں جھلملاتا قیمتی گلوبند ، اس پہ مناسب میک اپ۔۔۔بالوں کو جوڑے میں سمیٹے وہ سچ میں دیکھنے کی چیز لگ رہی تھی۔اس کے شوہر کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ اور اطمینان اس بات کا غماز تھا کہ وہ پہلو میں کھڑی ضوفشاں کی قربت میں مطمعن و شاد ہے۔وہ خود قیمتی سوٹ

میں ملبوس تھا۔ان دونوں کی تیاری بتا رہی تھی کہ وہ کہیں باہر جارہے ہیں۔لاؤنج میں قدم رکھتے ہی ان دونوں کی نگاہ ایک ساتھ شکیل الدین پہ پڑی جو اس کے بیٹے کو گود میں اٹھائے دوڑا چلا آرہا تھا۔بچے کے گھٹنے سے خون بہہ رہا تھا۔

''یہ کیا ہوا اسے؟''ضوفشاں کو پرے دھکیلتا وہ بے اختیار بچے کی طرف بڑھا۔وہ بے حد پریشان نظر آرہا تھا جبکہ بچہ زاروقطار رو رہا تھا۔ضوفشاں کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ایک عجیب سی ذلت محسوس ہوئی تھی اس پل کہ وہ چاہ کر بھی آگے نہ بڑھ سکی۔قدموں کو زمین نے جکڑ لیا تھا۔

''صاحب بابا سائیکل چلاتے گر پڑے''۔ملازم نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔ہمایوں بخت بچے کے زخمی پیر کا معائنہ کر رہا تھا۔

''تو تم اسوقت کہاں تھے، ہزار بار سمجھایا ہے بابا کے ساتھ ساتھ رہنا ہے''۔اچانک ضوفشاں ہوش میں آئی تھی۔فوراً آگے بڑھ کر اس نے شکیل الدین کو سخت لہجے میں سرزنش کی۔اس کے شوہر نے نہ شکیل

الدین کی رونی صورت پہ توجہ دی تھی نہ ہی ضوفشاں کے لہجے پہ وہ تو بس متفکر سا اپنے اکلوتے بیٹے کے زخم سے رستے خون کو دیکھ رہا تھا۔

''اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں''۔اس بار مخاطب ضوفشاں تھی۔

''آپ ریلیکس رہیں، بچے کھیل کود میں گر جاتے ہیں۔میں ہوں نا پھر کس بات کی پریشانی ہے''۔اس کے چہرے کے تاثرات پل بھر میں بدلے تھے۔چند لمحے پہلے والی سختی کی جگہ اب بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی۔نرمی سے اسے اپنے شوہر کی گرفت سے نکال کر اس کا ماتھا چوما۔ ضوفشاں کے لہجے کی مٹھاس اور تسلی دونوں ہی اسے مطمعن کرنے کے لئے کافی تھیں۔

''چلیں جی ماما آپ کو میڈیسن لگائیں گی اور اب بالکل نہیں رونا میرے بیٹے نے''۔اسے محبت سے پچکارتے وہ اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی۔بچہ ایکدم خاموش ہوگیا تھا اور اس کے ساتھ باپ کا پریشان چہرہ بھی پرسکون ہوگیا تھا۔

☆☆☆

بستر پہ چت لیٹے اس نے داہنے بازو سے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ رکھا تھا پر وہ اپنے اردگر د سے لاعلم نہ تھا۔اس کا مینیجر ہارون سعید اور ڈاکٹر رابیل سکندر بیڈ کے پاس کھڑے اسی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے جس میں اسے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہ تھی۔ہارون اس کی صحت کے متعلق استفسار کر رہا تھا اور رابیل پیشہ ورانہ انداز میں تسلی دے رہی تھی۔

"ڈاکٹر کیانی نے اوکے کردیا ہے اب آپ انہیں روم میں شفٹ کرواسکتے ہیں باقی کا ٹریٹمنٹ وہاں جاری رہے گا"۔فائل پہ ریمارکس لکھتے اس نے ہارون کو بتایا۔ہارون نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔جانے سے پہلے رابیل نے ایک نگاہ بستر پہ لیٹے مریض کو دیکھا۔وہ جانتی تھی وہ جاگ رہا ہے اور یقیناً اس گفتگو کو سن بھی رہا ہے لخلاقاً بھی اس نے شکریہ کہنے کی زحمت نہیں کی تھی۔سر جھٹکتے وہ دوسرے مریض کے پاس چلی گئی تھی۔ہارون اسی وقت باہر نکل گیا تھا

شائد وہ استقبالیہ پہ کمرے کے متعلق بات کرنے گیا ہو۔

ازلان نے گہری سانس لیتے اپنا بازو آنکھوں سے ہٹایا۔پردے کے پار سے رابیل کی آواز اب بھی ازلان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

☆☆☆

اس کی واپسی دوپہر کے بعد ہوئی تھی۔چہرہ اور جسم دونوں ہی بری طرح تھکے ہوئے تھے پر وہ ایکٹیو تھی۔یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے من مرضی کے کام سے اکتاتا نہیں۔کام جبراََ کیا جائے تو دلچسپی نہیں رہتی پر وہی سب اگر شوق سے ہو تو دلچسپ بھی لگتا ہے اور آپ مطمعن رہتے ہیں۔رابیل کے لئے بھی اس کا پیشہ، اس کی ملازمت ذمہ داری سے بڑھ کر اس کا شوق، اس کا جنون تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ باخوشی لمبی چوڑی ڈیوٹیاں کر لیتی تھی۔آج اس کی سالگرہ بھی تھی تو صبح ہی ڈاکٹر عاصم اور دوسرے اسٹاف نے اسے مبارکباد دی تھی۔ڈاکٹر عاصم نے ہر سال کی طرح گفٹ ہضم کرلیا تھا اور حسبِ سابق اس کا گفٹ ادھار تھا

جو یقیناً کسی خاص موقع پہ اکٹھے واپس ہوں گے۔۔ایسا رابیل کا کہنا تھا۔ کمالِ حیرت گھر میں ہو کا عالم تھا ورنہ عام حالات میں تو شور کی آوازیں باہر پورچ سے ہی سنائی دیتی تھیں اور کبھی کبھی تو مچھلی بازار سا گمان بھی ہوتا تھا۔(شگفتہ بیگم کے طنز)۔لاؤنج کی لائیٹیں بند تھیں اور اندر کسی بندہ بشر کا گمان بھی نہ تھا۔رابیل کا ماتھا ٹھنکا، (یہ سب لوگ کہاں چلے گئے) کسی انہونی کا احساس بھی ہوا تھا کہ آج اس کی سالگرہ والے دن وہ لوگ بناء بتائے کیسے کہیں جاسکتے ہیں۔سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا لیکن لائٹ آن نہیں ہوئی(لائٹ گئی ہوگی پر یوپی ایس بھی خراب ہے کیا)اچانک اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ کا احساس ہوا تھا۔ڈرتے ڈرتے وہ دھیمے قدموں سے چلتی کچن میں گئی۔کاؤنٹر پہ دھری پانی کی بوتل اٹھا کر منہ کو لگائی(ہوتیں سامنے شگفتہ بیگم تو سناتیں سو صلواتیں اس بدتہذیبی پہ) پیر گھسیٹتی وہ سیڑھیوں تک پہنچی اب تو نیند سے بھی حالت خراب ہورہی تھی اس پہ یہ اندھیرے کا خوف۔دل کیا الٹے پیروں گھر سے باہر

بھاگ جائے اور وہ کر بھی گزرتی کہ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا ، روشنی اور شور ایک ساتھ برآمد ہوا تھا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، ہیپی برتھ ڈے ڈیئر رابیل، ہیپی برتھ ڈے ٹو یو''۔مزینہ کے ہاتھ میں کیک تھا جس پہ ڈھیروں موم بتیاں روشن تھیں۔لہک لہک کر گاتے ان سب نے اسے چونکایا تھا۔سکندر حسین، شگفتہ، مزینہ، شجاع۔۔۔سب لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ایکدم چہرے پہ بے پناہ مسرت جھومنے لگی تھی پر غصہ بھی بہت آیا تھا۔

''آپ لوگوں نے تو جان ہی نکال دی تھی میری۔۔۔جانتے بھی ہیں اندھیرے سے کتنا خوف آتا ہے مجھے۔'' وہ لگ بھگ رو دینے کو تھی۔

''ارے بھئی آج کے دن جان نکل جاتی تو مستقبل کا ایک خرچہ کم ہو جاتا۔سالگرہ اور برسی اکٹھی منا لیتے ہم''۔سکندر حسین کی بات پہ اس نے ابرو اچکاتے منہ بنایا۔

’’مطلب آپ کو میرے مرنے کا کوئی غم نہ ہوتا‘‘۔شگفتہ بیگم نے سر پیٹ لیا۔

حد ہوتی ہے فضول گوئی کی بھی۔سالگرہ والے دن یہ کیا نحوست بھری باتیں شروع کر دی ہیں آپ دونوں نے‘‘۔انہوں نے باقاعدہ ڈپٹا تو رابیل اور سکندر حسین دونوں گلا کھنکھارتے موضوع بدل گئے۔

’’دِس از سو سویٹ اینڈ تھینک یو‘‘۔مزینہ کے ہاتھ میں پکڑے کیک کو دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

’’جیتا رہ میرا بچہ‘‘۔سکندر حسین نے شفقت سے اس کا ماتھا چوما۔

’’تھینک یو بابا۔آئی لو یو‘‘۔

’’آئی لو یو ٹو جانِ بابا‘‘۔

’’آپ دونوں باپ بیٹی کے بیچ اگر تھوڑی سی محبت بچی ہو تو میں بھی مبارکباد دے دوں‘‘۔شگفتہ بیگم کی بات پر وہ جلدی سے ماں سے لپٹ گئی۔

''سالگرہ مبارک ہو۔سو سال جیو''۔انہوں نے اسے محبت سے گلے لگایا اور ایک بڑا سا پیکٹ تھمادیا۔

''تھینک یو ماما لو یو''۔

''بھئی شجاع فائر برگیڈ کو کال کرو، کچھ جلنے کی بو آرہی ہے''۔سکندر حسین نے بآوازِ بلند کہا۔

''بابا آج کے دن تو ماما کو تنگ مت کریں۔آج میرا برتھ ڈے ہے''۔رابیل نے مداخلت کی ساتھ ساتھ وہ اپنے گفٹ کا ریپر بھی کھول رہی تھی۔

''یہ تو میرے مرنے کے بعد بھی مجھے بخشنے والے نہیں ہیں''۔اب سب لوگ لاؤنج میں رکھے صوفوں پہ بیٹھ چکے تھے۔مزینہ نے دل کی شکل کا کیک کافی ٹیبل پہ رکھا اور کچن کی طرف چلی گئی۔

''لو بھئی رابیل میرے اور مزینہ کی طرف سے تمہارا تحفہ اور جلدی سے اس دل پہ آری چلادو''۔وہ لوٹی تو ہاتھ میں پلیٹیں اور چھری

کانٹے تھے۔شجاع نے گفٹ پیک رابیل کی جانب بڑھایا۔وہ سکندر حسین کی بہن کا بیٹا تھا اور اس حساب سے ان کا دوہرا رشتہ تھا۔

''شجاع بھائی ویسے آپ بڑے کنجوس ہیں۔ایک گفٹ پہ ٹرخا دیا''۔گفٹ تھامتے منہ بنایا گیا تھا۔

''یار اب تک دو ہزار تحفے وصول کرچکی ہو تم ، رحم کھاؤ میرے حال پر بی بی چند ماہ بعد شادی ہے میری''۔اس عزت افزائی پہ اس نے سر پہ ہاتھ مارا۔

''نہیں ہوتے دیوالیہ آپ، ایک ہی تو سالی ہوں آپ کی ''۔رابیل کے طنز پہ مزینہ کی ہنسی نکل گئی۔

''ماموں جان آج میرا خیال ہے یہ طے ہوجائے آخر اس بندی سے میرا اصل رشتہ ہے کیا۔۔۔کبھی ماموں زاد بہن کر لوٹ لیتی ہے کبھی سالی بن کر جیب پہ ڈاکا ڈال لیتی ہے''۔ہاتھ پہ ہاتھ مار کر شجاع نے سکندر حسین کو مخاطب کیا۔

''خوش نصیب ہیں جناب ایک ہی بندی نے بہن اور سالی کا خانہ پر کر رکھا ہے''۔اس کا موڈ ٹھیک ہوا تو نیند اور تھکاوٹ دونوں دم دبا کر بھاگ گئے تھے۔یہی تو کمال تھا ان بہت پیارے اپنوں کا جن کے بیچ مشکل وقت بھی آسان ہو جاتا تھا۔جن کا التفات زندگی میں رر شنی بکھیرے ہوا تھا۔ایک طویل ڈیوٹی کے بعد یہ ہلکی پھلکی نوک جھونک اور شرارتیں اس کی اعصابی تھکن کو کم کرتیں اسے پر سکون کر رہی تھیں۔

''اللہ رحم کرے اس بیچارے پہ جس کی قسمت میں تم جیسی زنانہ ہٹلر لکھ دی گئی ہے۔''شجاع نے باقاعدہ دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''ویسے مزینہ یہ ہماری رابیل آج تک اندھیرے سے ڈرتی ہے''۔ شجاع نے چھیڑا۔

''لائٹ بھی اکثر جلا کر سوتی ہے ورنہ دو دو زیرو پاور کے بلب لگا رکھے ہیں۔اسی لئے میں آج تک اس کے کمرے میں نہیں سوئی''۔مزینہ نے ہنستے ہوئے بتایا۔

’’چھوٹی تھی ایک بار اندھیری جگہ سے خوفزدہ ہوگئی تھی بس اسی وقت سے ڈر بیٹھا ہے اس کے دل میں۔حالانکہ تمہارے بابا نے بہت کوشش کی پر اس کا یہ خوف کم نہیں ہوا‘‘۔شگفتہ بیگم نے رابیل کی طرف محبت سے دیکھا۔

’’یقیناً آسیب دیکھ لیا ہوگا‘‘۔شجاع ڈرامائی انداز میں بولا۔

’’اور وہ اس پہ عاشق ہوگیا ہوگا۔اسی لئے تو سب رابیل سے اتنا ڈرتے ہیں۔‘‘ وہ بھی آج اسے جی بھر کے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

’’یہ آپ لوگوں کو میری سالگرہ کا دن ہی ملا تھا میری برائیاں کرنے کے لئے‘‘۔اس نے منہ بنایا۔یہ طبلِ جنگ تھا۔اس سے پہلے کہ باقاعدہ لڑائی کا آغاز ہوتا مزینہ نے چھری اس کے ہاتھ میں تھمادی۔آخر کیک بھی تو کاٹنا تھا جس پہ جلتی موم بتیاں آخری سانسیں لے رہی تھیں اور بجھنے سے پہلے شعلے بھڑک رہے تھے۔زندگی کے ایک اور حسین اور خوبصورت سال کا اختتام ہوا تھا۔امیدوں بھرے نئے سال کی شروعات ہوئی تھی جہاں آگے چل کر کیا ہوگا کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

سیل فون کان سے لگائے وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ کئی بار کی کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ان کی جھنجلاہٹ کچھ اور بڑھی تھی۔میک اپ کی مہین تہہ تلے ماتھے کی سلوٹیں نمایاں ہوئی تھیں۔بے چینی ان کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔بار بار کی ناکامی کے بعد ایک اور سعی کی گئی تھی۔اس بار چہرے کا اطمینان اس بات کا غماز تھا کہ دوسری طرف بیل جا رہی ہے۔

''ازلان کیسا ہے؟''کال ملتے ہی بے اختیار سوال کیا گیا تھا۔

''وہ ٹھیک ہیں میم''۔ہارون کی آواز سن کر ایک پرسکون سانس سینے سے خارج ہوا تھا۔

''میں کوشش کر رہی ہوں جلد سے جلد پاکستان پہنچ جاؤں، چانس پہ ہے آج کی فلائٹ اگر مل گئی تو ان شاء اللہ میں کل پہنچ جاؤں گی''۔انہوں نے جلدی جلدی اپنا پلان بتایا۔

''یس میم''۔وہ مودبانہ انداز میں بولا تھا۔اگلے چند منٹ وہ اس سے ڈاکٹر کی رائے، طریقہء علاج اور اس کی طبیعت کو لے کر گفتگو کرتی رہیں۔

''میرے بیٹے کا خیال رکھنا ہارون وہ اس وقت تمہاری ذمہ داری ہے''۔یہ حکم میں لپٹی التجا تھی۔

''میں خیال رکھوں گا میم''۔جواب فوراً آیا تھا۔انہیں کبھی بھی اس کی وفاداری پہ شبہ نہیں تھا۔

''تم جانتے ہو وہ میرے لئے کتنا اہم''۔ان کے لہجے میں خوف تھا ۔

'' I'm fully aware of it MAM''۔(میں پوری طرح آگاہ ہوں میم) ہارون نے یقین دہانی کرائی۔رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔

''میم کل پہنچ رہی ہیں مسٹر شاہ''۔کال بند کرتے ہی اس نے بستر پہ بیٹھے اذلان کو مطلع کیا۔بیڈ ریسٹ سے ٹیک لگائے وہ اپنا لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔ہارون اور ڈاکٹر کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس نے

اپنا لیپ ٹاپ منگوا لیا تھا اور اس کی ضد کے آگے ہار مانتے ہوئے انہیں اس کی بات ماننا پڑی تھی۔یہ بھی غنیمت تھا وہ تین دن سے اسپتال میں تھا ورنہ اپنی تکلیف کی پرواہ کرنا اس کی فطرت سے ہٹ کر تھا۔ہارون کی یک طرفہ گفتگو وہ کام کے دوران سن چکا تھا مگر اس اعلان پر اس نے سر نہیں اٹھایا۔

''ویسے پرسوں تک آپ کو بھی ڈسچارج کر دیا جائے گا''۔وہ اب بھی مکمل انہماک سے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔کمرے میں ڈیوٹی نرس اس کی ادویات رکھنے آئی تو اسے لیپ ٹاپ میں محو دیکھ کر کچھ کہنا چاہا پر ہارون نے اشارے سے منع کر دیا۔نرس نے برا سا منہ منایا بہر حال وہ خاموش رہی۔ان وی آئی پی کمروں کے وی وی آئی پی مریضوں کے رویے اس کے لئے نئے نہیں تھے۔

''اسٹاف!''نرس کمرے سے نکلنے لگی تھی جب اسے آواز دے کر روکا گیا۔

’’وہ ڈاکٹر جس نے مجھے ایمرجنسی میں اٹینڈ کیا تھا وہ کہا ہے؟‘‘اس نے پہلی بار سر اٹھایا تھا۔لہجہ کسی حد تک سرد اور چہرے کے تاثرات بے حد سنجیدہ تھے۔

’’کون ڈاکٹر رابیل سکندر؟‘‘اس نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

’’رابیل سکندر۔۔۔‘‘اذلان نے زیرِ لب دہرایا۔

’’وہ تو شعبہِ حادثات میں ہوتی ہیں۔ویسے آج ان کی چھٹی ہے‘‘۔آنکھیں سکیڑے وہ کسی گہری سوچ کے زیرِ اثر چند لمحے اس بند دروازے کو دیکھتا رہا جہاں کچھ دیر پہلے نرس کھڑی تھی۔ہارون سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا پر کچھ کہا نہیں۔وہ جانتا تھا اسے بے موقع سوالات سے چڑ ہے۔

☆☆☆

طویل ڈیوٹی کے بعد تھکاوٹ شدید تھی اور نیند سے آنکھیں الگ بوجھ ہورہی تھیں اس لئے وہ لمبی تان کر سوئی تھی۔صبح مزینہ نے بمشکل اسے جگایا حالانکہ اس کا جاگنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا پر چونکہ شگفتہ

بیگم کی طرف سے حکم نامہ جاری ہوا تھا لہذا اٹھتے ہی بنی۔اب دو دن چھٹی تھی تو انہوں نے دھر لیا۔ سگھڑاپے پہ لیکچر، شادی کے بعد سسرال میں ماں کی ناک کٹوانے(جو ہر معمولی سی بات سے کٹ جاتی تھی اور اب تو کٹ کٹ کر نہ ہونے کے برابر رہ چکی تھی) کے طعنے تشنوں کے علاوہ اسے دوپہر کا لنچ بنانے کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی تھی۔مزینہ کو ان حالات میں اس پہ ہمیشہ کی طرح ترس آتا تھا۔آج بھی چھپ چھپا کر اس کی مدد کروا دی تھی۔شام کی چائے ان دونوں نے ٹیرس میں بیٹھ کر پی۔مزینہ ساتھ کباب فرائی کر لائی تھی۔سردی کی دھند بھری شام، الائچی کے دم والی خوشبو دار چائے اور خستہ شامی کباب۔دونوں مزے لے کر کھاتیں ساتھ ساتھ گپیں لگا رہی تھیں۔ رابیل کے پاس اسپتال کی کئی کہانیاں ہوتی تھیں جو وہ مزینہ کو سنانے بیٹھ جاتی۔ کبھی مریضوں کے مسائل، کوئی ایسا حادثہ جو اسے پریشان کرتا یا پھر ڈاکٹر عاصم کے چٹکلے۔آج موضوعِ گفتگو اذلان تھا۔ایک ایسا مریض جس نے شکریہ ادا کرنے کی بجائے الٹا اس کا نقصان کر دیا تھا اور پھر

معذرت بھی نہیں کی تھی۔پین ٹوٹنے سے بات اس کے عجیب و غریب رویے اور ضرورت سے زیادہ خاموشی پہ جا ٹھہری۔

''مجھے تو وہ کوئی سائیکو لگتا ہے''۔یہ مزینہ کا تبصرہ تھا۔

''اونہو، سائیکو نہیں ہے۔''گرما گرم کباب حلق میں انڈیلتے رابیل نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا تو پھر نارمل تھا''؟مزینہ نے ابرو اچکائے۔

''نہیں وہ نارمل بھی نہیں تھا لیکن میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتی وہ سحر جو اس کی شخصیت میں تھا۔

خوف۔۔۔۔۔کشش۔۔۔۔۔تکبر۔۔۔۔۔میں نہیں جانتی۔پر وہ بہت الگ تھا''۔نپے تلے لفظوں میں وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔اس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا وہ اس سے بری طرح متاثر ہوئی تھی۔

''اب تک پیشنٹ ڈاکٹرز سے مرعوب و متاثر ہوتے آئے ہیں اور تم پہلی ڈاکٹر ہو جو ایک مریض سے فیسینیٹ ہوئی ہو''۔مزینہ نے باقاعدہ قہقہہ لگایا۔وہ اب تک یہی سوچ رہی تھی کہ زخمی حالت میں

ایمر جنسی میں پڑا ایک ایسا شخص جس کے پاس کسی اپنے کا سہارا بھی نہیں تھا اور جس کا رویہ انتہائی عجیب اور غیر منطقی تھا اس سے کوئی عقل مند متاثر بھی ہوسکتا ہے۔

''ڈاکٹر بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں آپی کوئی پلوٹو سے تو آئے نہیں ہم۔''رابیل نے آنکھیں گھمائیں۔

''ایک بات بتاؤں، وہ بہت الگ سا تھا۔اس کی آنکھوں میں عجیب سا جنون تھا۔حالانکہ بڑی دلیر بن کر میں نے اس کا بازو پکڑ تو لیا لیکن یقین جانیں فرسٹ ٹائم کینولا لگاتے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے''۔اپنی طرف سے اس نے بہت بڑے راز سے پردہ اٹھایا تھا۔آواز دھیمی تھی۔ اپنی بات کے اختتام پہ محظوظ ہوتے وہ خود ہی ہنس پڑی تھی۔

''بابا کو پتا چلا تو انہوں نے تمہارا کیا ہی مذاق بنانا ہے''۔مزینہ بھی کھکھلا کر ہنسی۔

’’پلیز اب آپ مت بتادینا بابا کو پہلے ہی انہیں شک ہے میں کچھ دے دلا کر ڈاکٹر بنی ہوں یہ سنا تو کان پکڑ کر دوبارہ فرسٹ ائیر میں ایڈمیشن کرا دیں گے‘‘۔اس نے منہ بناتے التجا کی۔

’’ارے بھئی یہ کیا دینے دلانے کی باتیں ہورہی ہیں میری غیر موجودگی میں‘‘۔سکندر حسین ٹیرس میں داخل ہوئے اور ان دونوں کو سر جوڑے بیٹھے دیکھ کر گلا کھنکھارہ۔ان کے کانوں تک بس رابیل کا آخری جملہ ہی پہنچا تھا۔

’’کچھ نہیں بابا، کچھ بھی نہیں ہم تو بس۔۔۔ایسے ہی‘‘۔رابیل فوراََ سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔

’’ایک بات کان کھول کے سن لو تم دونوں، اس مہینے ایک روپیہ اضافی نہیں ملے گا کسی کو۔پہلے ہی تمہاری ماں نے خرچہ کروا کروا کر میری کمر توڑ دی ہے‘‘۔ان دونوں کے سنجیدہ چہرے دیکھ کر چند پل وہ کچھ سوچتے رہے اور پھر انگلی اٹھا کر تنبیہی انداز میں کہتے وہیں خالی کرسی پہ بیٹھ گئے۔ان کی آمد سے باتوں کا رخ بدل چکا تھا۔وہ تینوں کچھ دیر

یونہی گپیں لگاتے رہے اور پھر اندر چلے گئے۔رات خوبصورت اور اوس میں بھیگی دبے پاؤں اتر رہی تھی۔سردی کی شدت میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔

☆☆☆

اسپتال کے وی آئی پی روم کے گرم اور آرام دہ کمرے میں بستر پہ نیم دراز وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھا۔ہلکے بھورے بال بے ترتیبی سے ماتھے پہ بکھرے تھے۔شیو تھوڑی سی بڑھی ہوئی تھی۔ماتھے پہ زخم کا نشان نمایاں تھا جو اب بھرنے لگا تھا۔اس رف حلیے میں بھی وہ اپنی پرکشش شخصیت کی بدولت منفرد نظر آرہا تھا۔کمر کے بل لیٹے اس کی گہری سیاہ آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پہ مرکوز تھیں جن میں ہمیشہ کی طرح بے نام سی اداسی تھی۔بیڈ کے بالکل پاس ایک ادھیڑ عمر خاتون موجود تھیں جو مہنگا اور جدید لباس زیب تن کئے تھیں۔دودھیا مخروطی انگلیوں میں قیمتی ڈائمنڈ رنگز سجی تھیں البتہ چہرہ میک اپ سے عاری تھا جس پہ تھکن اور پریشانی نمایاں تھی۔

''اللہ کا شکر ہے تم ٹھیک ہو میرے بچے، تم اندازہ نہیں کرسکتے پچھلے تین دن میں نے کس عذاب میں گزارے ہیں''۔ہاتھ آگے بڑھا کر انہوں نے بس ایک لمحے کو اس کے بے ترتیب بالوں کو چھوا تھا۔اس کی اداس آنکھوں میں جھنجھلاہٹ نمودار ہوئی تھی۔فوراََ ہی انہوں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔ان کی آواز میں خوف تھا اور خوف کے کئی درجے ہوتے ہیں۔کچھ کھو دینے کا خوف، کسی انہونی کا خوف۔۔۔کسی بہت پیارے کی تکلیف کا خوف۔۔۔وہ بھی اس پل کچھ ایسے ہی خوف سے گزر رہی تھیں۔

''ڈونٹ وری ممی، اب تو آپ کی تسلی ہوگئی نا''۔اذلان نے نگاہیں دائیں جانب گھمائیں اور انہیں تسلی دی۔اس کا لہجہ نرم اور آواز دھیمی تھی۔مسکرانے کی ایک ناکام کوشش کی تھی اس نے پر وہ مسکراہٹ آنکھوں تک نہیں پہنچ پائی تھی۔اس کا انداز انہیں مطمعن کر گیا تھا کہ وہ ٹھیک ہے حالانکہ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ اسے اپنی تکلیف کہنے کی

عادت نہیں پر اس پل اس کے چہرے پہ یہ ہلکا سا تاثر دیکھ کر پچھلے تین دن کی پریشانی رخصت ہوئی تھی۔دل کو راحت ملی تھی۔

''گل خان کی موت کا بہت افسوس ہوا''۔اچانک انہیں یاد آیا تھا۔

''ہارون اس کی فیملی کیسی ہے''۔ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ پیچھے کھڑے اپنے مینیجر سے مخاطب تھا۔

''صدمے میں ہیں سر''۔ہارون سر جھکائے مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''ان کا خیال رکھنا، انہیں کسی چیز کی پریشانی نہ ہو۔''انداز حکمیہ تھا۔ہارون نے تائید میں سر ہلایا۔

''گل خان کی سیلری ہر ماہ باقاعدگی سے اس کی بیوی کو ملنی چاہیئے اور وہ گھر جہاں اس کی رہائش ہے اسے خرید کر اس کی بیوی کے نام کروا دو۔

میں نہیں چاہتا اس کی فیملی کو اس کے بعد کسی قسم کی مالی پریشانی کا سامنا ہو۔گل خان کی صورت ان کا جو خسارہ ہوچکا وہ ناقابلِ تلافی ہے لیکن۔۔۔''اپنے اسٹاف کے لئے وہ اتنا ہی متفکر تھا یہ بات وہ اچھے سے

جانتی تھیں اور یہ بھی انہیں معلوم تھا کہ گل خان اس کا بہت قریبی ملازم تھا۔اس کی سخاوت بھی ان سے پنہاں نہ تھی گو وہ کم ہی ظاہر کرتا تھا پر وہ بھی اس کی ساری خبر رکھتی تھیں۔

''ریلیکس اذلان۔تم کیوں اتنا اسٹریس لے رہے ہو۔تمہیں ابھی مکمل آرام کی ضرورت ہے میری جان۔ہارون اور میں سب دیکھ لیں گے بس تم ریسٹ کرو۔اینڈ ڈونٹ ٹیک ٹینشن۔اوکے؟'' اس سے پہلے کے ہارون جواب دیتا انہوں نے ٹوکا۔اس وقت تو وہ بس اسی کی جانب سے پریشان تھیں اسی لئے اتنی لمبی فلائیٹ کے بعد گھر جانے کی بجائے سیدھی اسپتال آئی تھیں۔

''ہارون تم میرے ساتھ آؤ مجھے ڈاکٹر کیانی سے ملنا ہے''۔اسے آرام کا کہہ کر وہ ہارون کے ساتھ اس کے معالج سے ملنے چلی گئی تھیں۔اذلان کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔کمرے میں سناٹا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''تمہارا مسئلہ کیا ہے؟''کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی ضوفشاں کے لبوں کی مسکراہٹ رخصت ہوئی تھی۔چہرے پہ غصہ اور نفرت سجائے اس نے تقریباً چیخ کر کہتے اسے بیڈ پر دھکیلا تھا۔

''ہر وقت اودھم مچایا ہوتا ہے گھر میں اور اسی چکر میں چوٹیں لگوا لیتے ہو۔''اس کی کمر پہ دو دھپ لگا کر وہ اپنا ردِ عمل ظاہر کرتی اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

شرم تو جیسے چھو کر نہیں گزری۔بدتمیز۔۔۔ماں نے تربیت کی ہی نہیں۔منحوس خود تو مر گئی میرے لئے عذاب چھوڑ گئی''۔بچہ خوف سے تھر تھر کانپتا اس حسین چہرے کے پیچھے چھپی بدصورتی سے سہما ہوا تھا۔ اس پہ خوف اس قدر شدت سے حاوی تھا کہ وہ اس پل رو بھی نہ سکا تھا۔

''آہ''۔میڈیکل باکس سے ڈیٹول کی بوتل نکال روئی پہ لگایا اور زخم پہ رکھ دیا۔بچہ جلن سے کرلایا۔ضوفشاں نے دانت کچکچاتے ایک اور تھپڑ مارا۔

''خبردار منہ سے اگر آواز نکالی ورنہ جان لے لوں گی''۔اس تنبیہہ پہ وہ معصوم بری طرح ڈر گیا۔

''اور اگر اپنے باپ کو بتایا تو اتنا ماروں گی اتنا ماروں گی ساری عمر یاد رکھو گے سمجھے''۔جان چھڑانے والے انداز میں جلدی جلدی دوا لگا کر اسے بستر میں پٹخا۔اس کا موڈ اس مداخلت پہ بری طرح خراب ہوچکا تھا ۔

''خبردار جو کمرے سے باہر نکلے ورنہ رات کو بھوکا سونا پڑے گا''۔اندر کی بھڑاس نکال کر اسے تنبیہہ کرتی وہ پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔بچہ خوف اور درد کی شدت سے کانپتا بستر میں دبک کر رونے لگا پر اس کی آواز کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی تھی۔دروازہ بند ہوچکا تھا اور باہر اس کا باپ اپنی حسین اور خوبصورت بیوی کے ہمراہ پارٹی میں جاچکا تھا۔

☆☆☆

اذلان آہستہ آہستہ رو بہ صحت تھا۔زخم بھر رہے گئے تھے نشان ابھی باقی تھے۔ گھر واپسی کے اگلے ہی دن وہ دفتر پہنچ گیا تھا۔ماں نے اس کی تیاری دیکھ کر منع کرناچاہا پر اس کے تاثرات نے کچھ کہنے ہی نہ دیا۔وہ جانتی تھیں اپنے سوا وہ کم ہی کسی کی سنتا مانتا ہے۔اسے اپنے فیصلوں میں کسی اور کی دخل اندازی پسند نہیں پھر بھلے وہ اس کا کوئی بہت اپنا ہی کیوں نہ ہو۔اپنی زندگی، اپنے کام، اپنے معاملات میں اسے دوسرے کی رائے درکار نہیں تھی۔اس کا اپنا اندازِ زندگی اور فلسفہِ حیات تھا اور وہ اپنے ہی طریقے سے زندگی گزارنا چاہتا تھا۔

دفتر میں اسکی غیر موجودگی کے باعث جو خلا آیا تھا اسے پر کرنے میں وقت لگتا حالانکہ وہ اسپتال سے بھی وقتاً فوقتاً کام نبٹاتا رہا تھا لیکن آج صبح سے اس کے پاس سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی۔ایک ہنگامی میٹنگ اور بے تحاشہ پینڈنگ کام کے ساتھ خیریت دریافت کرنے والی کالوں کا تانتا بندھا رہا۔وہ اچھی طرح جانتا تھا کاروباری رشتے منافع و خسارے کے ہوتے ہیں اور انہیں ہینڈل کرنا بھی اذلان شاہ کو بخوبی آتا تھا۔

’’ہارون مجھے اس کا مکمل بائیو ڈیٹا چاہئیے‘‘۔دن کے اختتام پر اپنے مینیجر کو مخاطب کرتے اس نے ایک چٹ اس کی طرف بڑھائی۔

’’مل جائے گا سر‘‘۔ہارون سعید نے کاغذ پہ لکھا نام پڑھتے مودبانہ انداز میں کہا۔اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ہمیشہ کی طرح سپاٹ جیسے وہ انسان نہیں کوئی روبوٹ ہو اور جس کا کنٹرول اذلان کے ہاتھ میں ہو۔

’’پیدائش سے لے کر آج تک ہر معلومات۔۔۔اس کا فون نمبر، ای میل ایڈریس، دوست، رشتے دار۔۔۔سب کچھ‘‘۔پین انگلیوں میں گھماتے وہ کمرے میں نصب شیشے کی دیوار کے پار دیکھ رہا تھا۔شہر اس وقت کسی راز کی صورت گہری دھند کی تہہ میں لپٹا ہوا تھا۔

’’کل تک ہوجائے گا مسٹر شاہ‘‘۔وہ گہری سوچ کے حصار میں تھا۔

’’ڈیٹس آل سر؟‘‘خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تھا۔

’’سینرجی گروپ کی فائل میں دیکھ چکا ہوں بٹ آئی تھنک اٹس ناٹ کا گڈ کیچ‘‘۔(لیکن میرا خیال ہے یہ اچھا سودا نہیں)وہ چونک کر پلٹا اور خود کو کمپوز کرتے بولا۔

''میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں''۔دو ٹوک کہتے اذلان نے میز پہ رکھی ای میلز دیکھنا شروع کر دیں۔رسمی خیریت کے پیغامات تھے جو مختلف لوگوں کی طرف سے موصول ہوئے تھے اور یقیناً ان کا جواب بھی اس کی سیکریٹری پہلے ہی بھیج چکی تھی۔

''ٹھیک ہے سر میں انفارم کر دیتا ہوں''۔ہارون سعید کمرے سے نکلنے لگا۔

''یہ کام priority basis پہ کرنا ہے''۔ہارون سعید کے ہاتھ میں پکڑی چٹ کو انگلی سے پوائینٹ کرتے اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔ ہارون نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے باہر آکر ہارون نے ایک بار پھر کاغذ پہ لکھے اس نام کی تصدیق کی جو اذلان نے اسے دیا تھا۔اسے شدید حیرت ہوئی تھی پر اپنے باس کی باتوں پہ حیرت کا اظہار کرنا اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا۔ وہ حکم کا غلام تھا اور اس وفاداری کے عویض بھاری معاوضہ وصول کرتا تھا۔ہارون جانتا تھا اذلان شاہ اپنے جمع تفریق سے چلتا ہے۔رشتے ہوں یا

کاروبار، وہ ہر فیصلہ دماغ سے کرتا تھا کیونکہ جذبات کا اس سے دور کا واسطہ نہیں تھا۔زندگی کا حاصل وہ تھا جو آج اس کی مٹھی میں تھا۔محنت اور سخت محنت کے ساتھ اپنی بہترین کاروباری فہم و فراست کو بروئے کار لا کر بہت مختصر وقت میں شاہ گروپ آف انڈسٹری کی اونچی عمارت کھڑی کرنے کا سارا کریڈٹ تنہا اذلان کو جاتا تھا۔دوسرے لفظوں میں ترقی کے اس سفر کے میں وہ "ون مین شو" تھا۔ وہ کسی مشین کی طرح کام کرتا تھا اور بلا کا اینٹی سوشل تھا۔بلاضرورت گفتگو سے اجتناب برتتا اور حد درجہ لوگوں سے ملنے سے احتراز رکھتا۔اسے ہجوم سے الجھن ہوتی تھی اسی لئے بہت کم وہ دعوت نامے قبول کرتا تھا سوائے چند ضروری جگوں کے جہاں اس کا جانا ناگزیر ہوتا ۔پھر ایسی کیا وجہ تھی کہ وہ ایک ایسے انسان کے متعلق تفصیلات جاننے میں دلچسپی رکھتا تھا جس سے اس کا بلواسطہ یا بلا واسطہ کوئی تعلق نہیں تھا۔وہ نہیں جانتا تھا اذلان پہلی بار دماغ سے نہیں دل سے سوچ رہا تھا۔عقل کی بجائے جذبات کے آسرے فیصلہ کر رہا تھا۔

'' رابیل سکندر۔۔۔آج سے پہلے کسی میں بھی اتنا حوصلہ نہیں ہوا کہ اذلان طیب شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکے لیکن تم نے یہ غلطی کی ہے اور تمہیں اس کی قیمت چکانی ہوگی''۔کمرے کے اندر بیٹھے اذلان شاہ نے مٹھی میں پکڑا قلم بھینچتے دانت پیستے دہرایا۔

☆☆☆

وسیع سبزہ زار میں گھری آشیانہ کی دھندلی عمارت کے ڈائننگ ہال میں مدھم روشنیاں ماحول کو پراسرار بنا رہی تھیں۔وسیع میز پہ دھرے کرسٹل اسٹینڈز میں شمعیں جھلما رہی تھیں۔کمرے میں ناگوار خاموشی تھی جسے وقفے وقفے سے چھری کانٹوں کا پلیٹیوں سے ٹکراتا شور توڑتا تھا۔دو ملازم ہاتھ باندھے میز کے پاس موجود تھے۔میز کے گرد مخالف سمتوں میں بیٹھے وہ دو نفوس انتہائی خاموشی سے اپنی پلیٹوں پہ جھکے کھانے میں مشغول تھے۔اچانک بیگم شاہ نے سر اٹھا کر پہلے اذلان کو اور پھر دونوں ملازمین کی سمت دیکھا۔ان کا اشارہ پاکر وہ سر جھکائے کمرے سے

نکل گئے تھے جبکہ اذلان سر جھکائے اپنے اردگرد سے بے نیاز ڈنر میں مشغول تھا۔

''ایسا کب تک چلے گا اذلان''۔دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسائے کہنی میز پہ ٹکائے وہ کچھ خائف سی تھیں۔آف وائیٹ ایمبرائیڈڈ سوٹ پہ سیاہ پشمینہ اوڑھے وہ سادہ و معتبر دکھائی دے رہی تھیں۔

''ہوں؟'' اس نے چونک کر سر اٹھایا۔وہ سنجیدہ نظروں سے اسی کو دیکھ رہی تھیں۔اذلان نے نا سمجھنے والے انداز میں کندھے اچکائے۔

''تم کب بڑے ہوگے؟'' اذلان کے ہونٹ سمٹے یوں جیسے اس نے اپنی مسکراہٹ پہ قابو پانے کی کوشش کی ہو۔وہ ایک بار پھر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''یعنی آپ کو میرے بڑے ہونے پہ شبہ ہے''۔ان کے طنز کو انجوائے کیا گیا تھا۔

''تو پھر کیوں بچے جیسا بیہیو کرتے ہو۔تم ایک شدید ایکسیڈنٹ سے گزرے ہو۔کل گھر پہنچے آج دفتر چل پڑے۔یہ کہاں کی عقلمندی

ہے"۔وہ مستقل سنجیدہ تھیں اور جانتی تھیں وہ ان کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکا ہے۔

''آپ کو یاد ہے جب میں چھوٹا تھا تو آپ نے ہی کہا تھا حادثے ہوتے رہتے ہیں ان میں اٹک نہیں جاتے۔۔۔جسٹ موو آن"۔کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے وہ دونوں بازو میز پہ ٹکائے ان کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔سنجیدہ۔۔۔سرد۔۔۔۔۔بے حس۔

''اِس حادثے میں اور اس حادثے میں فرق ہے۔یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی۔یہ جسمانی تھا وہ۔۔۔۔۔"وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں۔ گزرا وقت دہرانا تکلیف دہ ہوتا ہے اور جان بوجھ کر اس کے سامنے ماضی دہرا کر وہ اسے مزید تکلیف نہیں دے سکتی تھیں۔

''جسم کے گھاؤ بھر جاتے ہیں ممی انفیکیٹ بھر چکے ہیں"۔وہ عام سے لہجے میں بولا اور ایک بار پھر اپنی اسٹیک کھانے لگا۔

''تم شادی کرلو"۔اس کا ہاتھ ایک پل کو رکا مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

''اوہ کم آن۔۔۔۔آپ بات کو کہاں سے کہاں لے گئی ہیں''۔اذلان دل ہی دل میں ہنسا۔

''وہیں جہاں تم جانا نہیں چاہتے۔آئی مین میرا بھی دل کرتا ہے میرا بیٹا اپنی لائف میں سیٹل ہو جائے۔اس کی زندگی میں خوشیاں ہوں، رونق ہو۔میں اب تمہاری طرف سے مطمعن ہونا چاہتی ہوں''۔بیگم شاہ کچھ آگے کو جھکیں اور اسے رسانیت سے سمجھایا۔

''یہ جو آپ مجھے خوشیوں بھری آسودہ زندگی کے سبز باغ دکھا رہی ہیں نا یہ سب دھرے رہ جائیں گے جب آپ کا واسطہ حقیقت سے پڑے گا اور مجھے پچھتانے کا کوئی شوق نہیں''۔اس کا انداز استہزائیہ تھا۔

''تم اتنا منفی کیوں سوچتے ہو۔ہر عورت بری نہیں ہوتی۔ہر عورت موقع پرست نہیں ہوتی۔مجھے دیکھو کیا میں ایک وفا شعار بیوی نہیں تھی۔کیا میں دھوکے باز ہوں''۔وہ سنجیدہ مگر نرم لہجے میں بولیں۔اذلان کا چہرہ بے تاثر تھا۔

''آپ کو اگر ایسا لگتا ہے آپ مجھے اپنی مثالیں دے کر ایموشنلی قائل کر لیں گیں تو آپ غلط سوچ رہی ہیں کیونکہ میری زندگی میں جنسِ مخالف کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے''۔حسبِ توقع وہ قائل نہیں ہوا تھا۔

''تو پھر میں دعا کروں گی تمہاری زندگی میں وہ جگہ جلد بن جائے، کوئی ایسی لڑکی تمہاری زندگی میں آئے جس سے نا چاہتے ہوئے بھی تمہیں محبت ہو جائے۔پھر میں دیکھوں گی تم کیسے اپنی احمقانہ سوچ کی خاطر محبت سے لڑو گے''۔جب کوئی لاکھ کوشش کے باوجود آپ کی بات نہیں مانتا تو زچ ہو کر کچھ ایسی ہی باتیں زبان پہ آتی ہیں۔وہ بھی جذبات کی رو میں بہہ کر ایسی ہی بے سر پیر کی کہہ بیٹھی تھیں۔

''بد دعائیں دے رہی ہیں''۔وہ ہنسا۔

''ماں ہوں بد دعا تو مر کر بھی نہیں دے سکتی''۔وہ نیپکین سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

''اسے دعا بھی نہیں کہتے۔'' جتاتے ہوئے اس نے نیپکین میز پہ پھینکا۔

''مجھے اسٹڈی میں کچھ کام ہے میری کافی وہاں بھجوا دیں پلیز''۔ سنجیدگی سے کہتا وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور متانت سے چلتا ڈائننگ ہال سے باہر نکل گیا پیچھے وہ سر پکڑے بیٹھی رہیں۔ یہ کوشش بھی ناکام گئی تھی اذلان نے ان کی کسی بات کو سنجیدگی سے لیا ہی نہ تھا۔

☆☆☆

''گلفشاں'' میں اپنی آمد کے چند ماہ میں ضوفشاں اس قصر کے سیاہ و سفید کی مالکن بن گئی تھی۔ یہ اختیار اسے کسی اور نے نہیں اس کے شوہر نے دیا تھا جو اس پہ سو جان سے فدا تھا۔ اپنی اداؤں، نرم لہجے اور بے پناہ حسن کی بدولت وہ اس کی زندگی اور دل دونوں میں اپنا مقام بنا چکی تھی۔ وہ اس کی سنگت میں خوش اور مطمعن تھا۔ اپنی پہلی شریکِ حیات کی دس سالہ رفاقت کو بھولنے میں دس ماہ بھی تو نہیں لگے تھے اسے اور اس کا زیادہ کریڈیٹ ضوفشاں کو جاتا تھا جس نے اسے پیچھے مڑ

کر دیکھنے ہی نہ دیا تھا۔وہ ضرورت بن کر آئی تھی پر خواہش بن چکی تھی۔مرد کا دل ضرورت پہ مائل ہوتا ہے۔پتا ہی نہیں چلتا کب وہ ضرورت چاہت بننے لگتی ہے۔کہنے کو تو یہ شادی اس نے فقط اپنے کم سن بیٹے کی وجہ سے کی تھی۔ماں کی موت کے بعد اس کی زندگی میں جو جمود آگیا تھا اسے توڑنے کی خاطر ہی یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔دولت کی دیوی اس پہ مہربان تھی، اونچے حسب نسب کا ٹیگ نام کے ساتھ سجا تھا ایسے میں اس کی پہلی شادی اور بیٹے پہ کون توجہ دیتا، اس تک بھی بے شمار اونچے گھرانوں کی نگاہ ٹکی تھی پر اس کی نگاہِ انتخاب ضوفشاں تھی جس سے اس کی ملاقاتاتفاقاََ ہوئی تھی۔

بہار اپنی چھب دکھلا کر رخصت ہورہی تھی۔پیڑوں پہ نئی کونپلیں پھوٹ کر سنہری ہو چکی تھیں۔انہی دنوں وہ اپنی سائیٹ کے معائنہ کے لئے اسلام آباد گیا تھا اور وہاں سے ایک دن کے لئے بھوربن جہاں اسے ضوفشاں ملی جو وہاں گھومنے پھرنے آئی تھی۔اس کا ایک روزہ قیام ایک ہفتے میں کیسے بدلا یہ تو بس وہ جانتا تھا مگر اس مختصر وقت میں وہ

ضوفشاں سے شادی کا پختہ ارادہ کرچکا تھا۔وہ اس کے متعلق بہت زیادہ نہیں جانتا تھا مگر جتنا جانتا تھا اس کے اطمینان کے لئے کافی تھا۔وہ کسی اونچے خاندان سے تعلق نہ رکھنے کے باوجود بات چیت اور مزاج میں شہزادیوں سی آن بان رکھتی تھی۔اس کا انداز، اس کا آفاقی حسن اور سب سے بڑھ کر دلچسپ گفتگو سامنے والے کی توجہ بٹورتے تھے اور وہ جو خود کو بہت سنجیدہ مزاج اور رکھ رکھاؤ والا سمجھا جاتا تھا اس کی انہی خصوصیات پہ کھنچتا چلا گیا۔اس سے شادی کا فیصلہ دل و دماغ کا یکجا تھا۔ ضوفشاں اس کی پہلی شادی اور بچے سے باخبر تھی اور اسے کوئی اعتراض بھی نہیں تھا کہ وہ خود اس کے قدموں میں دل ہارنے کا دعوی کرچکی تھی۔شادی کے اوائل دنوں میں ہی وہ جان چکا تھا کہ اس کی بیوی اس سے بڑھ کر اس کے بیٹے کا خیال رکھتی ہے اور ایسا تھا بھی۔چند ہی دن میں بچہ اپنی نئی ماں سے حد درجہ مانوس ہوچکا تھا۔وہ اس کے سونے، جاگنے، کھانے ، پینے حتیٰ کہ اسکول تک کے معمولات کا خیال رکھتی۔ آہستہ آہستہ گھر کا سارا انتظام سرک کر ضوفشاں کی جھولی میں آگرا تھا۔

وہ اس پہ حد درجہ بھروسہ کرنے لگا تھا۔اور اب یہ دل تھا کہ سینے سے نکل کر پارے کی طرح ضوفشاں کی ہتھیلی پہ جا ٹکا تھا۔وہ فقط دل نہیں اس کی ذات پہ قابض ہوچکی تھی۔اس کی من پسند ہونے کے باوجود وہ اس کے سامنے کسی داسی کی طرح رہتی جو اپنی ذات، اپنا آپ اس پہ نچھاور کرنے کو تیار تھی۔وہ دیوتا تھا اور ضوفشاں پجارن۔۔۔۔اس مندر کی جسے محبت کرنے والے دل کہتے ہیں۔

پر یہ سب ظاہری تھی۔۔۔ضوفشاں کا باطن، اس کے ارادے وہ نہیں جانتا تھا۔چہرے پہ خوبصورت سی مسکراہٹ سجائے، اپنے میٹھے لہجے سے اپنے شوہر ہی نہیں وہ اس گھر کے ملازموں تک کو اپنی مٹھی میں لئے گھوم رہی تھی۔فقط چند ماہ میں ملازمین کی وفاداریاں بدل چکی تھیں۔وہ اس کی آنکھ کے اشارے سمجھتے تھے، اس کے حکم پہ چلتے تھے۔وہی کرتے تھے جو وہ چاہتی تھی اور وہ کیا چاہتی تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔کوئی جان بھی کیسے سکتا تھا کیونکہ اس کے راز میں کوئی دوسرا شریک نہ تھا سوائے اس کے۔۔۔جس کی پلاننگ پہ وہ یہ سب کچھ ہورہا تھا۔

☆☆☆

ایسا لگتا تھا درد کی شدت سے اس کا سانس رک جائے گا۔وہ بری طرح تڑپ رہا تھا ، سسک رہا تھا پر بے بسی کی انتہا تھی کہ احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔وہ چیخ چیخ کر سب کو اکٹھا کرلینا چاہتا تھا مگر آواز حلق میں اٹک گئی تھی۔جلن کا احساس پل پل اسے موت کی طرف لے جارہا تھا۔اس کی قوت مدافعت لمحہ بہ لمحہ ختم ہوتی جارہی تھی۔آنکھوں کے سامنے اندھیرا ناچ رہا تھا اور پھر دھیرے دھیرے اس کا وجود کسی گہری کھائی میں گرتا چلا گیا۔

وہ لرز کر بستر سے اٹھا تھا۔پورا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور خوف سے بری طرح کانپ رہا تھا۔اس کا تنفس تیز چل رہا تھا۔کمرے کی خاموشی میں اس کی تیز سانسوں کی آواز گونج رہی تھی۔

سالوں بعد بھی وہ لمحے اپنی پوری جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن کے پردوں پہ نقش تھے۔ہر ایک پل نشتر تھا جو آج بھی دل و دماغ کو چھلنی

کرتا اس کی خاموش زندگی میں زہر گھول رہا تھا۔زندگی بہت آگے بڑھ کر بھی آج وہیں کھڑی تھی۔ڈری ، سہمی اور۔۔۔۔۔۔۔خوفزدہ۔

☆☆☆

وہ ابھی دس منٹ پہلے دفتر سے گھر پہنچا تھا، لباس تبدیل کر کے لاؤنج میں آیا تو ضوفشاں اسی کی منتظر تھی۔

''سنئیے جی یہ سفیان ہے۔میں نے آپ سے ذکر کیا تھا میرے خالہ زاد بھائی''۔اس کے ساتھ ستائس اٹھائیس سال کا ایک آدمی تھا جو لباس اور صورت شکل دونوں سے ہی واجبی سا سا لگتا تھا۔ضوفشاں نے مسکراتے ہوئے اس کا تعارف کرایا۔

''ارے ہاں، یہ آگئے۔۔۔نائس ٹو سی یو''۔اس نے آنکھیں سکیڑ کر ذہن پہ زور ڈالا اور پھر اچانک اسے یاد آگیا۔ضوفشاں اکثر اس سے اپنے خاندان والوں کا ذکر کرتی تھی۔یوں تو اس کا اس دنیا میں ایک بڑی بہن کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا۔اپنے والدین کی وفات کے بعد وہی اس کا واحد آسرا تھی جو دوسرے شہر رہتی تھی اور اب اس سے ملنا جلنا

نہ ہونے کے برابر تھا پر اپنے ایک کزن کا ذکر وہ اکثر کرتی تھی جو اس کی خالہ کا بیٹا تھا۔ابھی چند روز پہلے بھی ضوفشاں نے اس کا تذکرہ کیا تھا ۔(اور یقیناً یہ سب گھڑی گھڑائی باتیں تھیں جو خود کو کور کرنے کے لئے بنائی گئی تھیں(

''شکریہ بھائی''۔سفید قمیض اور گرے پینٹ میں ملبوس شخص کے لہجے میں چاپلوسی تھی اور چہرے پہ عیارانہ مسکراہٹ۔دونوں ہاتھ مصافحہ کے لئے آگے بڑھائے وہ ضرورت سے زیادہ عاجزی دکھا رہا تھا۔

''سفیان اور میری امی میں بہت پیار تھا۔امی اور خالہ کی وفات کے بعد رابطے کم ہوتے گئے لیکن اب یہ شہر آئے ملازمت کے لئے اور مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے بلالیا''۔ٹانگ پہ ٹانگ جمائے وہ صوفہ پہ بیٹھ گیا۔ ضوفشاں بھی اس کے پہلو میں جا بیٹھی اور اس کا بازو تھامے مزید بولی۔

''بھائی تو کیا واقعی آپ کی کمپنی میں میرے لئے جگہ موجود ہے''۔ان دونوں کی تقلید میں سامنے والے صوفہ پر بیٹھتے وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔

''بھئی اب ضوفشاں کی سفارش ہے تو گنجائش نکالنی ہی پڑے گی۔ ہماری بیگم کہیں اور ہم نہ مانیں ایسے تو حالات نہیں''۔اس کی طرف دیکھتے وہ مسکرایا جس پہ ضوفشاں نے اترا کر گردن اکڑائی۔

''بہت بہت شکریہ بھائی جان''۔وہ ایک بار پھر اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر کمر تک جھک کر اس سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔اس کی ممنونیت پہ مسکراتے اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

''تم ایسا کرو کل میرے آفس آجانا اور ہاں یار تمہارا کزن آیا ہے کچھ خاطر تواضع کرو''۔انداز ہلکا پھلکا تھا۔ویسے بھی وہ خاصا کم گو تھا اور پھر اس سسرالی رشتے دار سے بار بار تشکرانہ کلمات سننا اسے بور کر رہا تھا۔

''جی میں بس ڈنر لگواتی ہوں''۔وہ دھیمے لہجے میں کہتی اپنا قیمتی لباس سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہ ہمارے صاحبزادے نظر نہیں آرہے کیا آج پھر جلدی سو گئے ہیں''۔اس کی توجہ اب سامنے چلتے ٹی وی کی اسکرین پہ تھی۔

''وہ جلدی نہیں سویا آپ لیٹ آئے ہیں''۔وہ مسکراتے ہوئے رکی۔

''یار اب اتنا بھی لیٹ نہیں ہوا وہی آج کل بہت جلدی سونے لگا ہے اور اسکول جاتے ہوئے بھی مجھ سے مل کر نہیں جاتا''۔یہ تو اب جیسے روز کا معمول بن چکا تھا۔کام میں الجھا وہ پہلے بھی اس کو بہت زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا۔اس کی شادی کرنے کی ایک بڑی وجہ بھی یہی تھی۔وہ تمام عمر بچے کو ملازموں پہ چھوڑ کر بیٹھ نہیں سکتا تھا اور ضوفشاں سے شادی کے بعد وہ واقعی ریلیکس ہوگیا تھا۔اس نے اس کی پریشانی اور بوجھ بانٹ لیا تھا پر یہ اس کی خام خیالی تھی۔شروع کے دن نکال کر وہ زہریلی ناگن اب آہستہ آہستہ اپنا زہر ان کی زندگی میں اتارنا شروع ہوگئی تھی۔اس کی غیر موجودگی میں وہ بچے کو بات بے بات ڈانتتی، مارتی یہاں تک کہ معمولی معمولی باتوں پہ کھانا پینا بند کر دیتی۔کبھی اسٹور تو کبھی باتھ روم میں لاک کرکے سزائیں دیتی۔بچے پہ اس کا

خوف اس قدر شدت سے حاوی ہوچکا تھا کہ وہ معصوم مزید سزا کے ڈر سے باپ کو بھی کچھ نہیں بتاتا تھا۔

''وہ اس لئے کیونکہ آپ اس وقت سو رہے ہوتے ہیں اور آپ کی نیند ڈسٹرب نہ ہو اسی لئے ہم آپ کو جگاتے نہیں۔اسکول جانے والے بچوں کی روٹین ایسی ہی ہوتی ہے نیند پوری نہیں ہوگی اس کی تو سارا دن اپ سیٹ ہوجائے گا''۔اس کی یہی کوشش ہوتی کہ ان باپ بیٹے کا سامنا کم سے کم ہو۔اسے اسکول کے بہانے جلدی سلا دیا جاتا حالانکہ وہ بیچارہ رات دیر تک اکیلا اپنے کمرے میں سسکیاں لیتا رہتا تھا۔صبح باپ کے جاگنے سے پہلے وہ اسکول چلا جاتا۔ویک اینڈ پہ بھی کچھ نہ کچھ مصروفیت چلتی ہی رہتی اور جو وقت وہ دونوں ساتھ گزارتے تو اس دوران وہ خود بھی موجود ہوتی۔اور اس کا خوف تو اب ایسا تھا کہ وہ شکایت کر ہی نہیں سکتا تھا۔

''اوکے باس جیسے آپ کی مرضی ہم تو یہ سب معاملات آپ پہ چھوڑ چکے ہیں اور اب راوی چین ہی چین لکھتا ہے''۔وہ جیسے ہار مانتے

ہوئے بولا پر اس بار میں بھی محبت تھی۔ اس کے شہد لہجے کے آگے کون ظالم حجت کر سکتا تھا۔

''میں کھانا لگواتی ہوں''۔ مسکراتے ہوئے ضوفشاں کمرے سے نکل گئی۔خود اس کی توجہ اب بھی ٹی وی پر تھی جبکہ تھوڑی پہ ہاتھ ٹکائے سفیان اسے ستائش بھری نظروں سے دیکھتا رہا اس وقت تک جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔کوئی اور وقت ہوتا تو اس باکمال اداکاری پہ وہ باقاعدہ کھڑے ہوکر اس کے اعزاز میں تالیاں بجاتا۔وہ دل ہی دل میں معترف ہوا تھا کیونکہ اب تک وہ یہی سوچتا تھا کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کمینہ کوئی دوسرا نہ ہوگا لیکن آج اس کے خیال کی نفی ہوگئی تھی۔

☆☆☆

صبح کا آغاز شدید اعصابی کھنچاؤ سے ہوا تھا۔رات کے پچھلے پہر اس ہولناک خواب کے سبب آنکھ کھلی تو وہ دوبارہ کوشش کے باوجود سو نہیں سکا تھا۔ہر بار کی طرح اس بار بھی اس کا خواب خوف و ہراس سے

شروع ہو کر اشتعال پہ آ ٹھہرا تھا۔ صبح تک وہ دوہری اذیت میں مبتلا تھا۔ ایک جسمانی تو دوسری ذہنی۔۔۔۔کچھ حالیہ ایکسیڈنٹ کی چوٹیں رہی سہی کسر اس ذہنی انتشار نے پوری کر دی تھیں۔اس کی گردن کا پچھلا حصہ بری طرح درد کر رہا تھا جس کی پرواہ کئے بغیر وہ اپنے اندر کا غبار کم کرنے اس سرد صبح میں بھی جاگنگ کے لئے نکل آیا تھا۔جاگرز پارک میں دھند کے سبب ویرانی تھی۔اوس کے ننھے قطرے نم گھاس پہ شبنم کے موتیوں کی طرح دمک رہے تھے۔سردی شدید تھی کہ ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔موسم کی شدت سے بے نیاز جاگنگ سوٹ میں ملبوس ٹریک پہ تیز قدموں سے دوڑا جارہا تھا۔کان میں ائیر فون لگائے میوزک کی دھن سے اپنا دھیان بدلنے کی کوشش کی تھی پر یہ اتنا آسان نہ تھا۔ آدھے رستے تک پہنچ کر اپنے پھولے ہوئے تنفس کو درست کرتے اس نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پہ رکھے اور گہرے لمبے سانس لینے لگا۔یہ اس کی سالوں کی روٹین تھی کہ جب بھی وہ ڈپریشن کا شکار ہوتا یا شدید ذہنی دباؤ محسوس کرتا تو بہت تیز دوڑ کر یا پھر گھنٹوں جم میں ایکسر سائز کرکے

خود کو تسکین دیتا۔اس پل بھی وہ کچھ ایسی ہی فیز میں تھا جہاں اسے کھلی فضا درکار تھی۔اس ٹھٹھرتی صبح میں تیز تیز سانس لے کر بھی اس نے خود میں بہتری محسوس نہیں کی تھی۔

''آخر کیوں ماضی میرا پیچھا نہیں چھوڑ دیتا''۔

''کیوں یہ آسیب بن کر میرے ساتھ چل رہا ہے''۔

''کیوں مجھے اس عفریت کے شکنجے سے نجات نہیں مل جاتی''۔

اور ان بہت سارے کیوں کے جواب میں بس ایک آواز سنائی دی تھی۔ دبی ، سہمی، درد میں لپٹی آواز۔۔''کیونکہ تم خود اس عذاب سے پیچھا چھڑانا نہیں چاہتے۔ تم خود ان لمحوں کو بھولنا نہیں چاہتے۔یہ اذیت تم نے خود چنی ہے کیونکہ۔۔۔۔۔تم ایک اذیت پسند انسان ہو۔ تمہیں خود کو درد میں مبتلا پاکر تسکین ملتی ہے۔ تمہیں دوسروں کو دکھ دے کر سکون ملتا ہے''۔

☆☆☆

شیشوں سے جھانکتی دھند بھری خنک صبح کا سحر اپنی جگہ پر آفس کے اندر سینٹرل ہیٹر کی گرمائش سکون دیتی تھی۔طبیعت خراب ہونے کے باوجود اذلان ابھی کچھ دیر پہلے ہی دفتر پہنچا تھا۔اپنے کیبن میں تنہا وہ پورے انہماک سے کمپیوٹر اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔کمرے کی خاموشی میں کی بورڈ پہ وقفے وقفے سے چلتی اس کی انگلیوں سے اٹھتا شور دراڑ ڈالتا تھا۔دروازے پہ دھیمی دستک کے ساتھ ہارون کی آمد ہوئی تھی۔ہاتھ میں پکڑا فولڈر مؤدبانہ اس کی میز پہ رکھ کر وہ اب اگلے حکم کا منتظر تھا۔

''پرائیوٹ اینڈ کانفیڈینشل''۔۔۔اپنے سامنے رکھے فولڈر کے اوپر لگے لیبل پہ نگاہ ڈالتے اذلان نے ہارون کی سمت دیکھا جو ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔میز سے فولڈر اٹھا کر اس نے ابرو اچکائے ہارون کو دیکھا جس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور پھر جس خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا تھا اسی خاموشی سے باہر چلا گیا۔تھوڑی کھجاتے اذلان نے فولڈر کھولا جس کے پہلے صفحے پہ ہیڈنگ کی صورت ''رابیل سکندر'' لکھا تھا اور نیچے

اس کی تصویر چسپاں تھی۔سرخ لباس پہ سفید اوور آل پہنے۔ہونٹوں پہ سرخ لپ اسٹک اور کانوں میں سنگل اسٹون اسٹڈز۔۔بال البتہ کھلے تھے۔وہ اس بار بھی اسے واجبی ہی لگی تھی لیکن اس کے چہرے کی دھیمی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں بلا کی شرارت اسے منفرد و نمایاں کرتی تھی۔جانے کیوں اس لڑکی میں اسے بلاوجہ انٹرسٹ ہونے لگا تھا۔ اگلے چند صفحات میں رابیل کے تمام کوائف درج تھے۔اس کی عمر، والدین کے نام اور پیشے، بھائی بہن و قریبی رشتے داروں کے نام اور ان کے متعلق ضروری معلومات۔وہ گہری نظروں سے ان کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک مقام پر جا کر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔کچھ سوچ کر اس نے انٹرکام اٹھایا۔

''ہارون''۔دوسری جانب کال ریسیو ہوتے وہ عجلت میں بولا تھا۔

''سینرجی کو جواب بھیج دیا؟''اس کا انداز متفکرانہ تھا۔

''نہیں سر ابھی ڈرافٹ تیار کروا رہا ہوں''۔ہارون کی تاویل پہ ایک سکون بھری سانس اس کے سینے سے خارج ہوئی تھی۔

''ہولڈ آن۔۔۔۔میں وہ کمپنی خریدنا چاہتا ہوں''۔اس کا انداز دو ٹوک تھا۔

''لیکن سر۔۔۔۔''ہارون متعجب سا ریسیور ہاتھ میں تھامے بیٹھا رہا دوسری طرف رابطہ منقطع ہوچکا تھا۔

☆☆☆

سفیان اگلے ہی دن اس کے شوہر کے ہمراہ دفتر پہنچ گیا تھا۔ضوفشاں کا حوالہ تھا اسی لئے بناء کسی ہچکچاہٹ اسے اسسٹنٹ مینیجر کی پوسٹ پہ رکھ لیا گیا تھا۔شروع کے چند دن تو کام سیکھنے اور دفتری معاملات سمجھنے میں گزرے اور اس دوران سفیان نے اس پہ اپنا اعتبار کچھ انداز میں قائم کیا تھا کہ وہ اسے کئی معاملات میں براہِ راست شامل کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے صلاح مشورہ بھی کرنے لگا تھا۔اس کے سامنے بھیگی بلی بنا سفیان اپنے مخصوص چاپلوسانہ انداز کی بدولت اس کی گڈ بکس میں داخل ہوچکا تھا۔وہ اس شہر میں اجنبی تھا اور فی الوقت رہائش کا کوئی مناسب انتظام بھی نہ تھا تو اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ان دونوں نے

اسے اپنے گھر کے گیسٹ روم میں ٹھہرایا ہوا تھا اور اس طرح وہ گھر اور دفتر دونوں جگہ یکساں اثر انداز ہورہا تھا۔ظاہر ہے سفیان خود بھی یہی چاہتا تھا آخر یہ سب بھی تو ایک پلان کا حصہ تھا۔
ایکسپو جرمنی میں اس کی شمولیت ضروری تھی ایسے میں اس کی غیر موجودگی میں سفیان سے زیادہ قابلِ بھروسہ اور کون ہوتا جسے گھر اور دفتر دونوں کی نگرانی سونپی جاتی پر وہ غافل یہ نہیں جانتا تھا وہ اس چور کے ہاتھ اپنی تجوری کی چابی تھما کر جارہا ہے جو ایک لمبے عرصے سے اس پہ نقب لگائے بیٹھا تھا اور آج گھر کا بھیدی بن کر اسے برباد کرنے والاہے۔اس کی موجودگی میں بھی سفیان دیر تک دفتر میں اس کے ساتھ رہتا تھا مقصد اس پہ نظر رکھنا تھا اور آج کل تو وہ ملک میں تھا ہی نہیں لہذا وہ دیر سے ہی گھر پہنچتا تھا۔نو بجے وہ گھر پہنچا اور دھڑلے سے سیدھا ضوفشاں کے کمرے میں جا گھسا۔وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بنی سنوری کھڑی خود کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھی جب اس نے اسے بانہوں کے گھیرے میں لیا۔

''اوفوہ کیا کر رہے ہو کسی کی نگاہ پڑ گئی تو قیامت آجائے گی''۔اس نے احتجاج کیا پر اسے خود سے الگ نہ کیا۔درپردہ وہ بھی اس شرارت سے محظوظ ہوئی تھی۔

''قیامت تو آچکی ہے میری جان، اس ٹھاٹھ باٹھ میں کیا ستم ڈھا رہی ہو میرا تو دل ہی ہاتھوں سے نکلے جارہا ہے''۔اسے سینے سے لگاتے وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

''اپنے دل کو ابھی قابو میں رکھو منزل اتنی آسان نہیں ذرا سی بے دھیانی ساری بازی پلٹ سکتی ہے''۔اسے خود سے پرے دھکیلتی وہ مسکراتے ہوئے بیڈ پہ جا بیٹھی۔

''نخرے کرنے لگی ہو میری رانی، ویسے کمال کی اداکارہ ہو تم۔اس سیٹھ کو کیا خوب قابو کیا ہے''۔سفیان بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''چپ رہو بنا بنایا کھیل مت بگاڑ دینا۔دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں''۔اس نے کندھے پہ ہلکی سی چپت لگائی۔

''وہ لائے ہو''۔اچانک اسے یاد آیا تھا۔سفیان نے اثبات میں سر ہلاتے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

''یہ لو''۔سفید کاغذ کی بنی ایک پڑیا اس کی طرف بڑھائی تو ضوفشاں کی آنکھوں میں شیطانی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا نہ، میرا مطلب یہ ایکدم مر تو نہیں جائے گا''۔آنکھیں سکیڑے اس نے تصدیق چاہی۔

''ارے میری بلبل، ڈرتی کیوں ہے۔بس ایک قطرہ ہر روز پلاتی جا ۔۔۔سالا آہستہ آہستہ لاغر ہوتا جائے گا اور ایک دن اس کا کام تمام ''۔اس کے گالوں کو چھوتے وہ شوخی سے بولا۔

''سب کو یہی لگنا چاہیئے یہ کسی موذی مرض کا شکار ہوکر طبعی موت مرا ہے''۔وہ سنجیدہ تھی۔

''ایسا ہی ہوگا سرکار''۔سفیان نے دھیمی آواز میں کہتے اس کی گردن کو چھوا۔

''اور تم آہستہ آہستہ اس کا اعتبار جیتو، دفتر کا ہر معاملہ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔اس کی زمین ، جائیداد ، بنک بیلنس شئیرز۔۔۔تمہارے پاس ہر چیز کی پوری معلومات ہونی چاہیئے''۔وہ مزید بولی لیکن وہ اب اس کے حسن کے سامنے مدافعت کھونے لگا تھا۔اس کی خوشبو سے ہوش و خرد کا دامن چھوٹنے لگا تھا۔

''تم بے فکر ہوجاؤ بس اس پلِے کو سنبھالنا میں وہاں آکٹوپس کی طرح اس کو اپنے شکنجے میں ایسے جکڑ لوں گا کہ وہ لاکھ کوشش کے باوجود میری گرفت سے نکل نہیں پائے گا''۔اسے اپنی گرفت میں لیتے سفیان گھمبیر لہجے میں بولا۔رات کے اس پہر شیطان ان دونوں پہ اتنی بری طرح حاوی تھا کہ اپنے مکروہ فعل کا پردے رکھنے کو دروازہ بھی لاک نہیں کیا گیا تھا۔گھر میں کوئی ملازم رات کو نہیں ٹھہرتا تھا اور وہ تو یہی سمجھے تھے کہ بچہ اب تک سو چکا ہوگا پر یہ ان کی بھول تھی۔اپنے باپ کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں گھستے سفیان کو تو وہ دیکھ چکا تھا اور پھر دروازے کی جھری سے جھانکتی نظروں نے انہیں ایک

ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا تھا۔خوف سے کانپتے وہ تقریباََ بھاگتا ہوا اپنے کمرے تک آیا تھا اور دروازہ لاک کر کے جانے کتنی ہی دیر روتا رہا تھا۔ان کی بدکاری کا وہ واحد چشم دید گواہ تھا۔عمر کے اس حصے میں اس کا معصوم دماغ ان کی گھناؤنی حرکت کا سیاق و سباق نہ جانتا تھا پر اسے یقینِ واثق تھا کہ جو ہو رہا وہ ٹھیک نہیں۔۔۔وہ غلط ہے۔وہ بہت غلط ہے پر وہ چاہ کر بھی یہ سب کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

مزینہ کی شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی باقاعدہ تیاریوں کا آغاز ہو گیا۔ حالانکہ شگفتہ بیگم سالوں سے اس کی شادی کو لے کر کچھ نہ کچھ اکٹھا کئے ہوئے تھیں پر اب لگ رہا تھا سب کچھ نئے سرے سے شروع کیا جارہا ہو۔آئے دن وہ اور مزینہ بازاروں کے چکر لگا رہی تھیں۔ایک کے ساتھ چار نئی چیزیں آتی اور دو پھر چھوٹ جاتیں جس پہ گھر آکر شور مچتا، شگفتہ کا بی پی بڑھتا اور سکندر حسین کی جیب کا وزن کم ہو جاتا۔ رابیل حسبِ معمول اسپتال میں الجھی ان تیاریوں کو کم ہی وقت دے

پاتی تھی مگر مزینہ کی تمام شاپنگ دیکھ کر اس پہ اپنی رائے ضرور دیتی۔ آج بھی ان دونوں کی واپسی کے بعد سب سامان لاؤنج میں بکھرا تھا۔ رابیل بھی اتفاق سے اسی وقت لوٹی تھی تو منڈلی جمی ہوئی تھی۔

''آپی یہ والا سوٹ تو بہت ہی زبردست ہے، میرا خیال ہے اس کے ساتھ یہ سیٹ ظالم لگے گا''۔ آلیو گرین کلر کے کامدار سوٹ کو سراہتے اس نے اپنی رائے دی۔

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہی تھی اور یہ جھمکے کیسے لگ رہے ہیں۔ اس ریڈ کے ساتھ میچ کریں گے نا''۔ مزینہ نے جھمکے کان سے لگاتے رائے مانگی۔

''قسم سے ایک دم فرسٹ کلاس۔'' اس نے بھرپور انداز میں داد دی۔ تھکاوٹ اور لمبی ڈیوٹی کے بعد بھی وہ خوشگوار موڈ میں تھی البتہ چہرے سے تھکن نمایاں تھی۔

''اب بہن کے جہیز کی چیزیں دیکھ کر ہی خوش ہوتی رہو گی یا اپنے لئے بھی کوئی فیصلہ کرو گی''۔شگفتہ بیگم بیٹی کا اترا ہوا چہرہ بغور دیکھتے بولیں۔

''ماما آپ پھر شروع ہوگئی ہیں''۔حسبِ سابق اس کا منہ بن گیا تھا۔

''تمہاری عمر میں میرے دو بچے ہوگئے تھے بی بی''۔جتاتے انداز میں مثال و موازنہ حاضر تھا۔

''مزینہ کا تو چلو نکاح ہوچکا تھا چار سال پہلے پھر شجاع باہر پڑھنے چلا گیااس لئے وقت نکل گیا لیکن تم نے آخر کیا سوچا ہے ؟''وہ ان دنوں سنجیدگی سے رابیل کی شادی کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ان کی خواہش تھی مزینہ کی شادی کے بعد جلد از جلد اس کے فرض سے بھی سبکدوش ہوا جائے۔یہ بھی اتفاق تھا کہ بڑی بیٹی سالوں سے منسوب تھی جبکہ اس سے فقط ایک سال چھوٹی کے لئے اب تک رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی اور وجہ وہ خود تھی کیونکہ اپنی تعلیم مکمل

کرنے سے پہلے وہ کسی جھنجٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتی تھی دوسرے سکندر صاحب کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی کہ اس مشکل روٹین میں اس کا دھیان کسی اور طرف لگایا جائے لہذا وقت گزر رہا تھا لیکن اب تو ماما جانی کا بس نہیں چلتا تھا کہ کل ہی اچھا سا رشتہ دیکھ کر اسے رخصت کر دیں۔

''بیگم صاحبہ اس گھر میں سوچنے سمجھنے کا کام فقط آپ کے ذمہ ہے ہم سب کو آپ لاٹھی سے ہانکتی جس طرف چاہتی ہیں لے جاتی ہیں''۔سکندر حسین کی موجودگی میں ماحول کا سنجیدہ رہنا مشکل ہی نہیں نا ممکن تھا۔

''سکندر حسین اتنے معصوم آپ ہیں نہیں جتنے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں''۔وہ چڑ کر بولیں۔

''پتا نہیں آپ کو یہ شک کیسے گزرا حالانکہ میں تو پیدائشی معصوم تھا، ابا اور اماں میں تو باقاعدہ جنگ چلتی رہی کہ میرا نام معصوم حسین ہو''۔جواب انتہائی معصومانہ آیا تھا۔

''موضوع بدلنے کی ضرورت نہیں ہے، میں کہتی ہوں اب کیا یہ یونہی ہسپتالوں کے دھکے کھاتی رہے گی۔اپنا گھر کب بسائے گی''۔وہ بھی ان حربوں سے اچھی طرح واقف تھیں۔بات ایک بار پھر وہیں سے شروع ہوچکی تھی۔

''ماما تو کیا یہ میرا گھر نہیں؟''رابیل رنجیدہ سی بولی۔

''بالکل ہے، سو فیصد تمہارا ہی گھر ہے پر میری گڑیا آخر سب بیٹیوں کو بیاہ کر ایک نہ ایک دن تو دوسرے گھر جانا ہوتا ہے نا۔''انہوں نے پچکارا۔

''ہاں تو ہوجائے گی شادی بھی میرے سر میں کون سے سفید بال آگئے ہیں''۔وہ تنک کر بولی۔

''شادی تو اس وقت ہوگی جب تم کوئی گھرداری بھی سیکھو گی۔ نمک اور چینی میں فرق کا تو پتا نہیں تمہیں۔اگلے گھر جاکر ڈسپرین کی گولیوں

اور پینسلین کے انجیکشنز پلاؤ گی انہیں"۔ان کے لاکھ کہنے کے بعد بھی وہ کم ہی گھر کے کاموں کو ہاتھ لگاتی تھی، اس لئے نہیں کہ اسے کچھ پکانا
نہیں آتا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ جو بھی کرلے شگفتہ بیگم کوئی نا کوئی معمولی نقص ڈھونڈ کر چار باتیں سنا ہی دیتی تھیں۔اپنی طرف سے تو یہ سب ان کا اصلاح کا ایک انداز تھا پر وہ منہ بسورتی پیچھے ہٹ جاتی تھی۔نارمل سا کھانا تو پکا ہی لیتی تھی وہ تو بس یہی ٹھیک تھا۔ویسے بھی مزینہ کے ہوتے اسے کم ہی کچن میں جانے کا موقع ملتا۔اب بھی اسے چینی نمک کے فرق پہ صلواتیں سنادی تھیں۔

''اس معاملے میں تو یہ بالکل آپ پہ گئی ہے یاد ہے آپ کے ہاتھ سے بھی کتنی ہی بار نمک والی چائے پی تھی ہم نے"۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی سکندر صاحب کی کب سے بے چین ٹانگ درمیان میں آگئی تھی۔بیٹھے بیٹھے وہ پھلجڑی چھوڑی کہ شگفتہ بیگم کو مرچیں لگا دیں۔لب

دبائے مزینہ نے سامان سمیٹا اور رابیل جوتے ہاتھ میں پکڑے چپ چاپ کھسک لی۔

''کچھ تو خدا کا خوف کریں ، بارہ مصالحوں کی بریانی اور نہاریاں اپنے ان گناہ گار ہاتھوں سے پکا کر کھلاتی رہی ہوں تمام عمر آپ کو۔پر یاد رہی تو نمک والی چائے''۔سیڑھیاں چڑھتے اس کے کانوں سے شگفتہ بیگم کی تاسف میں ڈوبی آواز ٹکرائی۔

☆☆☆

سفیان کا تعلق لوئر مڈل کلاس کے ایک ایسے گھر سے تھا جہاں غربت ، اخلاقیات کو کھا جاتی ہے۔ایک موذی بیماری سے اپنے جواں سال باپ کی موت کے بعد اس نے زندگی میں بدترین وقت دیکھا تھا۔بھوک اور افلاس سب سے پہلے عزتِ نفس کو اژدھا بن کر نگل لیتے ہیں اور اس کا عملی مظاہرہ اس نے اپنے گھر میں دیکھا جہاں چار بچوں کے پیٹ کا دوزخ بھرنے کی خاطر اس کی ماں نے اپنی سب سے قیمتی چیز بیچ ڈالی تھی۔وہ جو سونے میں تل کر بھی واپس نہیں آسکتی تھی اس عزت کو بیچ کر اولاد

کے لئے روٹی خریدی گئی تھی۔حالات کا مارا انسان فطرتاً جلد باز ہے اسی لئے توکل کا مفہوم نہیں جانتا۔یہ سودا دنیا و آخرت دونوں میں خسارے کا تھا۔حرام مال سے اولاد کی پرورش کرنے والے ان کی رگوں میں زہر بھرتے ہیں اور پھر وہ زہر معاشرے کا ناسور بن جاتا ہے۔سب سے بڑا بیٹا ہونے کے سبب سفیان اپنے خاندان کی خستہ حالی سے واقف تھا تو ہر اس گالی کا مفہوم بھی جانتا تھا جو ایک جسم بیچنے والی ماں کی اولاد کو ملتی ہے۔حالات تو خیر کبھی نہیں بدلے تھے پر

وہ اپنی قسمت بدلنے گھر سے نکل گیا تھا۔ان نامساعدہ حالات کے باوجود سفیان نے انٹر کیا تھا لیکن کہیں بھی ڈھنگ کی ملازمت نہیں ملی تھی۔ اس کے باقی بھائی بہن تو خیر یہ بھی نہیں کر سکے تھے۔ماں کی موت سے پہلے ہی وہ گھر چھوڑ چکا تھا۔وہ اپنی قسمت خود بنانا چاہتا تھا اور قسمت اسے ستارہ بائی کے پاس لے آئی تھی۔

ضوفشاں کا تعلق اسی بدنامِ زمانہ باز ار سے تھا کہ شرفاء میں جس کا نام لینا بھی اپنی توہین سمجھا جاتا تھا۔وہ ستارہ بائی کی سب سے حسین، کم سن

اور نخریلی بیٹی تھی۔چونکہ اب اونچی پگڑے والوں کی اس بازار میں جاتے شان گھٹنے لگی تھی تو ستارہ نے بھی اپنا اصل ٹھکانہ چھوڑ کر شریفوں کی بستی میں سکونت اختیار کی۔وہ اسی مٹی کی بودوباش تھی جو مردوں سے تعلقات فقط ایک چیز کے لئے قائم کرتی ہیں اور وہ ہے پیسہ اور یہاں بھی وہ اس سے محروم نہیں ہوئی تھی۔۔پر اپنی روایت کے برعکس ضوفشاں محبت کا روگ لگائے بیٹھی تھی وہ بھی سفیان رفیق سے جوراتوں رات دولت کمانے کی ترکیبیں سوچتا ، ہوائی قلعے بناتا اور دن میں کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتا۔نئے علاقے میں رئیسوں کو ایسے گھروں کا راستہ سفیان کی بدولت پتا چلتا بدلے میں وہ اسے کچھ نہ کچھ عنایت کرتے۔ضوفشاں کو اس کام میں دلچسپی نہ تھی۔اسے سفیان کے ساتھ گھر بسانا تھا۔بچے پیدا کرنے تھے۔شریفانہ زندگی گزارنی تھی اسی لئے ایک دن اس کی خاطر رات کے اندھیرے میں ستارہ بائی کا سارا زیور اکٹھا کر وہ سفیان کے ساتھ بھاگ گئی۔وہ تو اس سے فورا شادی کرنا چاہتی تھی لیکن سفیان کا فی الحال اس سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔وہ غریب

پیدا ہو کر غریب نہیں مرنا چاہتا تھا۔ضوفشاں جو ماں کا زیور لائی تھی وہ بھی اس کے لئے باعثِ تسلی نہ تھا۔اسے کروڑوں چاہئیے تھے جو کبھی ختم نہ ہوتے اور اس کا بس ایک ہی طریقہ تھا۔کسی رئیس کے گھر ڈاکا ڈالا جاتا اور اس کے کروڑوں ہی ہتھیا لئے جاتے کیونکہ اتنا پیسہ سفیان اپنی زندگی میں کما تو سکتا نہیں تھا لہذا سوچ سمجھ کر پلان کے تحت ہمایوں بخت کا انتخاب کیا گیا تھا۔بھوربن میں ضوفشاں کی ہمایوں بخت سے ملاقات اسی سازش کا حصہ تھی جس کا ماسٹر پلانر سفیان تھا۔اسے ضوفشاں میں اس لمبی چوڑی جائیداد سے بڑھ کر دلچسپی نہ تھی۔ہمایوں بخت جیسی بڑی آسامی کو پھانسنے کے لئے ضوفشاں کانٹے میں پھنسی بیٹ تھی اور آج اس کی بدولت چند ماہ میں سفیان اس کے گھر اور دفتر دونوں میں جگہ بنا چکا تھا۔اگلا مرحلہ مشکل تھا پر وہ دونوں پوری تیاری کر چکے تھے لیکن جس راز کو وہ دونوں اب تک چھپاتے آئے تھے اس میں کوئی تیسرا شریک ہو چکا تھا۔

موسم نے کروٹ بدلی تو سورج نے اپنی چھب دکھلائی۔بہار کی آمد تھی ایسے میں پورا شہر کاسنی اور پیلے پھولوں کے رنگوں سے سجا تھا۔ موسم بدلا تھا پر زندگی کا معمول نہیں۔اپنا راؤنڈ مکمل کرکے وہ اسٹاف روم میں چلی آئی۔اتفاق سے کمرہ خالی تھا تو صوفے پہ پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔آج تو آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہورہی تھیں۔اسی وقت ڈاکٹر عاصم کمرے میں داخل ہوا۔ہاتھ میں دو مگ تھام رکھے تھے۔

''یہ لیجئے آپ کی چائے''۔آتے ہی ایک کپ رابیل کی طرف بڑھایا۔

''تھینک یو سو مچ ، اسوقت سچ میں اس کی طلب ہورہی تھی''۔کپ تھامتے رابیل نے تشکرانہ انداز میں کہا۔

''کیا ہوا خیریت، دشمنوں کی طبیعت ناساز لگ رہی ہے''۔صوفے پہ بیٹھتے ڈاکٹر عاصم نے سوال کیا۔رابیل کا چہرہ اور لہجہ دونوں ہی چغلی کھا رہے تھے۔

''نہیں بس تھکاوٹ بہت زیادہ ہے۔آپی کی شادی ہے نا تو کاموں کا ایک انبار ہے اور پھر یہ ڈیوٹیاں۔''گھونٹ بھرتے رابیل نے ہلکے پھلکے انداز میں وضاحت کی۔

''تو چھٹی لے لیں۔میں کور کرلوں گا''۔ڈاکٹر عاصم نے تجویز کے ساتھ مدد کی آفر کردی۔

''تھینک یو سو مچ، شادی کے لئے تو لیو اپروو ہے میری ان دنوں آپ کو ہی مینیج کرنا ہوگا لیکن ابھی تو کام چل رہا ہے''۔رابیل اس خلوص پہ متشکر تھی پر چہرہ اب بھی اداس تھا یا شائد متفکر۔

''کیا بات ہے رابیل آپ کو پہلے کبھی اتنا خاموش نہیں دیکھا ، کیا کوئی اور بات بھی ہے۔میں آپ کا دوست ہوں آپ مجھ سے شئیر کر سکتی ہیں اگر مناسب سمجھیں تو''۔عاصم کو فکر ہوئی۔ان دونوں کا برسوں پرانا ساتھ تھا اور رابیل کم ہی اتنی سنجیدہ ہوتی تھی۔

''بات ہے بھی اور نہیں بھی۔''رابیل نے بتانا شروع کیا۔

’’آجکل ماما روز میری شادی کا قصہ لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔پہلے تو بابا کی وجہ سے مذاق میں بات ٹل جاتی تھی لیکن اب وہ بھی ان کے ساتھ مل چکے ہیں ‘‘۔یہ بات کوئی نئ نہیں تھی کہ شگفتہ بیگم اس کی شادی کا قصہ نکال کر بیٹھی ہوتی تھیں مگر کل رات جب سکندر صاحب نے بھی ان کی تائید کی اور رابیل کو سنجیدگی سے کوئی فیصلہ کرنے کا کہا تو وہ الجھ سی گئی۔اب تک زندگی جن ہنگاموں میں الجھی ہوئی تھی شادی کے متعلق دھیان گیا ہی نہیں تھا۔اپ سیٹ ہونے والی بات تھی بھی اور نہیں بھی۔

’’تو پھر‘‘۔عاصم تشویش سے بولا۔رابیل کے لئے اس کے دل میں جذبات دوستی سے بڑھ کر تھے۔یہ اور بات وہ کبھی کھل کر اظہار نہیں کرپایا تھا کیونکہ رابیل کا مزاج عام لڑکیوں سےقطعاََ مختلف تھا۔پر عاصم کی پسندیدگی دراصل محبت تھی۔

’’بس پھر کیا۔۔۔ماما کی وارننگ ہے اس بار جو پہلا رشتہ میرے لئے آیا اس کے ساتھ مجھے کان پکڑ کے رخصت کر دیا جائے گا‘‘۔رابیل بے بسی سے ہنسی۔

’’رابیل میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا کافی عرصے سے لیکن بس۔۔۔‘‘شائد اب وقت آچکا کہ عاصم اپنے دل کا حال رابیل کو کہہ سنائے ورنہ یہ خاموشی اس کے مخالف ہو جاتی۔کچھ سوچ کر اس نے بات کا آغاز کیا لیکن قاصد کو دیکھ کر جملہ ادھارا چھوڑ دیا۔

’’ڈاکٹر صاحبہ یہ پیکٹ آپ کے لئے آیا ہے‘‘۔قاصد نے ایک چھوٹا سا پیکٹ رابیل کی طرف بڑھایا جو خوبصورت گفٹ پیپر میں لپٹا ہوا تھا۔

’’میرے لئے؟‘‘رابیل نے تحیر سے پہلے اس سنہری پیکٹ کو دیکھا پھر ایک نگاہ سامنے بیٹھے عاصم پہ ڈالی۔

’’جی کوئی آدمی ریسیپشن پہ دے کر گیا تھا اس پہ آپ کا نام بھی لکھا ہے‘‘۔قاصد نے وہ بتایا جو اس کے علم میں تھا۔

''اسٹرینج''۔پیکٹ پہ واقعی رابیل کا نام لکھا تھا۔

''اچھا جی شکریہ''۔پیکٹ کو الٹ پلٹ کرتے رابیل نے قاصد سے کہا۔وہ الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔

''کس نے بھیجا ہے؟''عاصم نے سوال کیا۔اس کی بات تو خیر ادھوری ہی رہ گئی تھی۔

''بھیجنے والے کا نام نہیں''۔رابیل نے بتایا۔

''کھول کے دیکھیں''۔عاصم کی طرف دیکھتے رابیل نے کچھ سوچتے ہوئے سنہری کاغذ کھولنا شروع کیا۔اندر ایک میٹل باکس تھا جس پہ ایک چھوٹا سا کاغذ چسپاں تھا۔

''ازالہ!''رابیل نے کاغذ اتار کر عاصم کو دکھایا۔اس کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔اسی وقت ڈاکٹر عاصم کی کال آگئی اور وہ اسٹاف روم سے نکل گیا۔رابیل اب تنہا تھی۔

''پین؟''باکس کھولا تو ایک قیمتی کرسٹل جڑا سلور پین مخملی ڈبیہ سے نکلا۔حیرت در حیرت تھی۔

"Swarovski Crystal" ' ' یہ ایک انتہائی مہنگا قلم تھا جس کی قیمت لاکھوں میں تھی۔رابیل کا دماغ سن ہو گیا تھا۔غائبانہ ملنے والے اس تحفے کو بھیجنے والے کے نام کا اندازہ وہ نہیں لگا پائی تھی کیونکہ اپنی زندگی کی مصروفیات میں الجھے اب اتنے ماہ بعد بھی وہ واقعہ کسے یاد رہتا ۔

☆☆☆

اسپتال میں روز چیزیں ٹوٹتی ہیں، روز نقصان ہوتے ہیں۔ کبھی ڈاکٹروں کے، کبھی ڈاکٹروں سے۔۔۔مہنگے انجیکشن نرسوں سے گر جاتے ہیں تو کبھی مریض ڈھیروں نقصان کرجاتے ہیں۔ایسے میں رابیل کا ایک پرانا قلم ٹوٹنا ایسا کوئی اہم واقعہ نہیں تھا جو اتنے ماہ بعد بھی دلوں پہ نقش رہتا اور اس پین کے ملتے ہی رابیل کو حرف با حرف سب یاد آجاتا۔یوں بھی وہ ان دنوں کسی اور بات کو دل پہ لگائے بیٹھی تھی۔لیکن یہ گمنام تحفہ اسے پریشان کر گیا تھا۔ہر بار کی طرح یہ معاملہ بھی اس نے مزینہ سے ڈسکس کیا۔

''یہ کیا ہے؟''وہ دونوں اس وقت لاؤنج میں اکیلی تھیں۔مزینہ اپنی شادی کے جوڑے استری کرکے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی جب رابیل نے پین نکال کر مزینہ کے سامنے رکھا۔وہ چونکی۔

''آپ کو کیا دکھائی دے رہا ہے؟''رابیل جل کر بولی۔

''پین''۔مزینہ ایک بار پھر اپنے کپڑوں میں لگ گئی تھی۔

''جی پین''۔رابیل نے جملہ اٹھایا۔

''ہاں تو اس میں کیا بڑی بات ہے''۔مزینہ نے کندھے اچکائے۔ اس کا ابھی ڈھیروں کام پڑا تھا۔

''اسے کھول کر دیکھیں''۔رابیل کے کہنے پر مزینہ نے ہاتھ بڑھا کر قلم اٹھایا۔

''اچھا ہے اور شائد مہنگا بھی''۔تعریف کی اور واپس رکھ دیا۔

''مہنگا نہیں بہت بہت مہنگا ہے''۔رابیل نے معلومات میں اضافہ کیا۔

' 'تو کیوں خریدا اتنا مہنگا پین''۔اس کی اب بھی سمجھ میں یہ معمہ نہیں آیا تھا۔

' 'خریدا نہیں یہ گفٹ ہے''۔اس نے مزید بتایا۔

' 'واؤ۔کس نے بھیجا''۔

' 'معلوم ہوتا تو کیا یہ اب تک میرے پاس ہوتا''۔رابیل غصے سے بولی۔

' 'گریٹ، یعنی تمہیں کسی نے ایک نہایت قیمتی تحفہ بھیجا ہے اور اس نے اپنا نام بھی راز رکھا ہے۔رابیل یقیناً کسی کو تم پہ سیکرٹ کرش ہو گا۔ہاؤ رومانٹک''۔مزینہ نے خوب انجوائے کیا۔

' 'مجھے تو کوئی پاگل لگتا ہے۔اتنے مہنگے پین کون خریدتا ہے وہ بھی کسی کو تحفہ دینے کے لئے۔اب کیسے پتا لگاؤں کس نے بھیجا ہے''۔رابیل نے واپس میز پہ پٹختے جھنجلا کر کہا تو مزینہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

' 'بھئی دنیا میں پاگل اور جنونیوں کی کمی نہیں۔باقی تمہیں ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے جو ہو گا خود سامنے آجائے گا''۔اس کے نزدیک

اس وقت دنیا کا اہم ترین مسئلہ یہ جوڑے تھے جنہیں تہہ لگا کر ایک عدد سوٹ کیس میں پیک کرنا تھا۔

''اور اس کا کیا کروں''۔رابیل الجھی۔

''اٹھا کر کچرے کے ڈبے میں پھینک دو''۔مزینہ کو بھی غصہ آگیا خوامخواہ رابیل فضول سی بات کو ایشو بنا رہی تھی۔

''آر یو سیریس''۔وہ بے یقینی سے بولی۔

''مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو ، وہ کرو جو تمہیں ٹھیک لگتا ہے۔ویسے ٹیسٹ کمال ہے اس بندے کا وہ جو بھی ہے''۔مزینہ کو ہنستے دیکھ کر رابیل نے آنکھیں گھمائیں اور پھر وہ بھی مزینہ کے ساتھ پیکنگ میں مدد کروانے لگی۔

☆☆☆

مزینہ کی شادی تک کیا بھاگم بھاگ مچی تھی۔شاپنگ، تیاریاں، گہما گہمی اور شور شرابا۔شادی کا دن آیا اور گزر گیا۔آج ولیمہ کی تقریب تھی جس کا اہتمام مقامی فائیو اسٹار ہوٹل میں تھا۔شجاع کا حلقۂ احباب چونکہ اس

کے دفتری لوگ تھے لہذا تقریب محدود پر شاندار تھی۔سیاہ شیفون پہ ہلکا سا کام والا انگرکھا اور جامہ وارٹراؤزر کے ساتھ کامدار دوپٹے میں وہ بہت اسٹائلش لگ رہی تھی۔بال کھلے تھے اور کانوں میں آویزے اس کی تیاری کو مکمل کرتے تھے۔اسٹیج پہ کچھ وقت مزینہ اور شجاع کے ساتھ گزار کر وہ چندرشتے داروں سے ملتی ملاتی پول سائیڈ پہ نکل آئی۔

''میں سوچ رہا تھا یہ یقیناً آپ ہوں گی''۔ایک غیر شناسا آواز پہ وہ چونک کر پلٹی۔

''ڈاکٹر رابیل سکندر۔واٹ آ پلیزنٹ سرپرائز''۔سیاہ ڈنر سوٹ میں وہ دل جلانے کی حد تک ہینڈسم لگ رہا تھا۔ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو، پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے وہ بڑے جتانے والے انداز میں بولا۔

''مسٹر شاہ۔۔۔نائس ٹو سی یو''۔رابیل اپنی حیرت پہ قابو پاتے بمشکل مسکرائی۔

''آپ یہاں؟''وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔یہ جگہ ان کی پرائیوٹ تقریب کے لئے بک تھی تو پھر اذلان طیب شاہ کا یہاں کیا کام۔

''مجھے مسٹر کمال نے انوائٹ کیا ہے''۔وہ متحیر ہوئیعادتاََ ماتھے پہ بل نمودار ہوئے۔

''وہ میری کمپنی میں کام کرتے ہیں''۔اذلان نے مزید بتایا۔

''اوہ۔۔۔شجاع کمال میرے ماموں زاد بھائی ہیں اور میری بہن کے شوہر''۔اسے ساری بات سمجھ آگئی تھی۔

''گڈ مبارک ہو آپ کو بہت''۔اس کے ہونٹوں پہ بڑی موہوم سی مسکراہٹ تھی۔

''شکریہ''۔رابیل کو اس کا مسکرانا اچھا لگا تھا ورنہ تو اسپتال میں دو دن وہ بس اینگری ینگ مین ہی بنا رہا تھا۔اپنے حساب سے وہ بات ختم کرچکی تھی لہذا پلٹ کر وہاں سے جانے لگی پر اذلان شائد بات اب شروع کر رہا تھا۔

''میں سمجھا تھا میرا شکریہ ادا کرنے کے لئے آپ یقیناََ مجھے کال کریں گیں۔۔لیکن۔۔۔اینی وے۔۔۔''اس نے مڑ کر دیکھا۔

''کیا مطلب۔میں سمجھی نہیں''۔یہ شخص اسے مستقل حیران کرنے پہ تلا ہوا تھا۔ایک تو ویسے ہی وہ اس کی نظروں سے کنفیوز ہورہی تھی۔کچھ وہ پہلے ہی اس کی شخصیت سے متاثر تھی اور اب یہ کوئی نئ بات نکال کر بیٹھ گیا تھا۔

''حالانکہ مشکل بات تھی نہیں ویسے بھی میں نے آپ کا نقصان کیا تھا '' ازالہ '' تو بنتا تھا پھر شکریہ کیسا''۔اس ایک لفظ پہ زور دیا گیا۔

''ازالہ ''۔۔۔۔''ایک منٹ ایک منٹ۔۔۔وہ پین آپ نے بھیجا تھا''۔رابیل کے سسپنس کا خاتمہ ہوا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ۔۔مجھے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔''اس پزل کو اس نے خود ہی حل کردیا تھا۔

''آپ کو وہ نہیں بھیجنا چاہیئے تھا۔اگر اس پہ بھیجنے والے کا نام پتہ لکھا ہوتا تو میں اسی وقت واپس بھجوا دیتی''۔یہ جان کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی پر رابیل آج تک اس قیمتی تحفے کو قبول نہیں کرسکی

تھی۔یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا کہ انجان لوگوں سے تحائف وصول کرے اس لئے کچھ خفگی کا اظہار کیا۔

''شائد یہی سوچ کر نہیں لکھا تھا''۔نچلا لب دبائے اذلان نے مسکراہٹ روکی۔

''میں بس ایکسکیوز کرنا چاہتا تھا اپنے طریقے سے''۔اس نے مزید کہا تو رابیل نے نفی میں سر ہلایا۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی اور وہ پین بہت مہنگا ہے میں اتنے مہنگے قلم کا کیا کروں گی۔مجھے ضرورت نہیں اس کی ''۔رابیل نے صاف گوئی سے بتایا۔

''وہی کیجئے گا جو اس قلم سے کرتی رہی ہیں جس کے ٹوٹنے پہ آپ کا چہرہ پل میں مرجھا گیا تھا۔یقیناً اس سے مہنگا تو نہیں ہو سکتا وہ''۔اذلان نے تمسخر سے کہا اور رابیل کو اس کا یہ انداز بالکل اچھا نہیں لگا۔

''وہ مہنگا نہیں قیمتی تھا۔کچھ چیزوں کی اہمیت ان کا پرائس ٹیگ نہیں، دینے والے کی محبت اور اس کا خلوص ہوتا ہے۔وہ میرے بابا کا گفٹ تھا اور اس کا کوئی متبادل نہیں ہوسکتا۔''اپنی ناپسندیدگی کو لفظوں میں ڈھال کر اس نے اذلان پہ یہ واضح کردیا تھا کہ وہ اس کے پیسوں سے متاثر نہیں ہوئی۔

''اچھا فلسفہ ہے۔امتحان میں اچھے نمبر ملتے ہیں ایسی باتیں لکھنے پر''۔وہ اذلان شاہ تھا۔سامنے والے کی نفسیات پڑھنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔اس کے طنز کا برا مانے بغیر وہ بہت اعتماد سے بولا۔اس سے پہلے کہ رابیل کوئی جواب دیتی وہاں شجاع آگیا۔یقیناً اسے اذلان کی آمد کی خبر ہوگئی تھی۔

''ویلکم سر۔۔۔آپ کی آمد نے میرا مان بڑھایا ہے۔میں بہت مشکور ہوں''۔وہ مؤدب بولا اور پھر پاس کھڑی رابیل سے اذلان کا تعارف کروانے لگا۔وہ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں یہ جان کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

''آپ نے خلوص سے بلایا تھا اس لئے چلا آیا۔ویسے بھی پیار اور خلوص انمول ہوتے ہیں ان کا کوئی متبادل نہیں۔۔۔ایسا ابھی کچھ دیر پہلے سنا میں نے''۔بڑا جتاتا سا انداز تھا اس کا مفہوم شجاع کو تو سمجھ نہیں آیا تھا کیونکہ وہ پس منظر سے واقف نہ تھا پر پاس کھڑی رابیل ضرور جانتی تھی یہ اسے سنایا گیا ہے۔وہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی تھی۔شجاع کے ساتھ اذلان اب مزینہ سے اس کا تعارف کروانے اسٹیج کی طرف جارہا تھا۔

☆☆☆

عورت ذات سے تو اسے ویسے ہی چڑ تھی اس پہ ایک عام سی لڑکی کا یہ اعتماد، وہ اسے بالکل اچھی نہیں لگی تھی پر اسے ذہن سے نکال بھی نہیں سکا تھا۔اس سے چڑ زیادہ تھی یا اس کی کشش، اذلان خود کو وہ سب کرنے سے روک نہیں پایا جو آج سے پہلے اس کے نزدیک ہرگز منطقی نہ تھا۔وہ جو سب کو ان کے مقام پہ رکھتا تھا ، لڑکیوں کو تو ویسے ہی گھاس نہیں ڈالتا تھا۔اس کی غیر جذباتی طبیعت اور خشک مزاجی کی بدولت اس

کی پیٹھ پیچھے اسے مغرور کا طعنہ ملتا تھا پھر اچانک رابیل سکندر سے حادثاتی ملاقات نے اس کی زندگی میں طوفان برپاء کردیا۔اس نے واقعی اسے سر پہ سوار کرلیا تھا۔اسی لئے تو اس کے کوائف حاصل کرنے کے بعد ایک ایسی کمپنی خرید لی جس میں اس کی دلچسپی صفر بھی نہیں تھی۔

شجاع اسی کمپنی میں کام کرتا تھا اور رابیل تک پہنچنے کا اس سے اچھا اتفاقی ذریعہ اور کیا ہوسکتا تھا۔ہارون اس کے فیصلے پہ حیران تھا اور جانتا تھا یہ سب ہرگز عقلمندانہ نہیں کیونکہ اگر اس کا باس رابیل کو پسند کرتا ہے تو اس طریقے سے اس تک پہنچنا حماقت ہے پر وہ اذلان کے سامنے اعتراض کرنے والا کون ہوتا تھا۔دوسرے اسے کیا معلوم محبت اور نفرت کے انداز الگ ہوتے ہیں۔

اذلان نے وہ قیمتی پین رابیل کو بھیجا تو اسے اندازہ تھا شائد وہ اس کا سراغ پاجائے مگر رابیل ایک تو اس واقعے کو بھول چکی تھی دوسرے اپنی مصروفیات میں الجھی رہی۔جب اذلان سے اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا تو اس نے شجاع کو اکسایا۔وہ شادی کے لیے لیو اپلائی کر رہا تھا اذلان

نے اسے ایسا الجھایا کہ وہ خوشی خوشی اس کی میز پہ دعوت نامہ رکھ آیا۔ اس کے لئے تو یہ خوشی کی بات تھی گو اسے یقین نہیں تھا وہ ولیمے پہ پہنچ جائے گا پر اس نے اذلان کی آمد کو اعزاز کی طرح لیا تھا کہ یہ تھا بھی ایک اعزاز پر یہ اس کے لئے نہیں تھا۔

صبح کا آغاز غیر متوقع تھا۔اس نے اپنی میز پہ وہ کرسٹل پین بمعہ شکریہ نوٹ دیکھا۔رابیل نے ایسا کرکے اسے حیرت میں مبتلا کردیا تھا۔وہ مڈل کلاس لڑکی اذلان طیب کا لاکھوں کا تحفہ اس کے منہ پر مار رہی تھی۔اس کے غصے میں اضافہ ہوا تھا۔کچھ سوچتے ہوئے اس نے رابیل کا نمبر ملایا۔

''جانتی ہیں کسی کا تحفہ واپس کرنا بھیجنے والے کے خلوص کی توہین ہوتی ہے''۔بناء تمہید شکوہ کیا گیا تھا۔

''معذرت چاہتی ہوں میرا مقصد آپ کی دل آزاری نہیں مگر میں نے آپ کو اسی دن بتا دیا تھا میں اتنی قیمتی چیز ایکسیپٹ نہیں کر سکتی''۔تو کیا پیسوں کی اس کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں۔اذلان متاثر ہوا تھا۔وہ اسے اگر اپنے پیسوں سے متاثر کرنا چاہ رہا تو وہ نہیں ہوئی تھی۔

اسے شدید حیرت ہوئی۔رابیل کو اندازہ نہیں تھا وہ اسے ڈائریکٹ کال کر دے گا۔(پتا نہیں اس شخص کے پاس میرا ذاتی نمبر کہاں سے آیا)وہ بس سوچ ہی سکی۔

''میں تو سمجھا تھا آپ کے نزدیک چیزوں کی قیمت ان پہ لگا پرائس ٹیگ نہیں بلکہ بھیجنے والے کا خلوص ہے''۔کل شام کے حوالے سے جتایا گیا تھا۔

''مسٹر شاہ وہ صرف اس صورت جب دو لوگوں کے درمیان کوئی رشتہ ہو اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور میں بھی کہ ہمارا ایسا کوئی تعلق نہیں''۔اسے اس آدمی کی یاداشت پہ حیرانی ہوئی تھی۔ اپنی عجیب فطرت کے باوجود وہ اسے مرعوب و متاثر کر رہا تھا۔

''تعلق ملنے جلنے سے بنتے ہیں۔ویسے سنا ہے آپ دوستی خوب نبھانا جانتی ہیں اور بد قسمتی سے میری زندگی میں دوستوں کی شدید کمی ہے''۔کرسی کی بیک سے ٹیک لگاتے وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

''اور یہ بات بھی یقیناً آپ تک اسی ذریعہ سے پہنچی ہو گی جہاں سے آپ نے میرا کانٹیکٹ نمبر حاصل کیا''۔اس بات کے بعد رابیل کے پاس شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔یقیناً اذلان اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

''فون پہ معذرت قبول نہیں کرتا میں وہ بھی اس صورت جب کال میری طرف سے کی گئی ہو۔آپ نے میرا تحفہ ٹھکرایا ہے ایک کپ کافی تو ساتھ پی سکتی ہیں۔''اس کی بات کو نظر انداز کرکے اذلان نے عجیب فرمائش کی تھی۔رابیل شدید کنفیوز ہورہی تھی۔کہاں تو نظر اٹھا کر نہیں دیکھ رہا تھا کہاں یہ توجہ وہ بھی اتنی چھوٹی سی بات پہ۔اس کا دماغ کل رات سے سوچ سوچ کر پھٹا جارہا تھا اور اب تو مزینہ بھی نہیں تھی جس کو ساری بات بتا کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیتی یا مشورہ ہی لے لیتی۔

☆☆☆

''کچھ اپنے بارے میں بتایئے۔''مقامی فائیو اسٹار ہوٹل کے کافی شاپ میں دھیمی سی موسیقی ماحول کو پرفسوں بنا رہی تھی۔رابیل سلور

گرے سلک شرٹ اور سیاہ ٹراؤزر میں ہمیشہ کی طرح سادہ اور اسٹائلش نظر آرہی تھی۔بال آج باندھ رکھے تھے۔اذلان نے اسے کافی پہ مدعو کیا تھا اور وہ اسے انکار نہیں کر پائی تھی۔اذلان اس کے بالکل سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بری طرح کنفیوز کر رہا تھا۔وہ آج بھی اتنا ہی متاثر کن لگ رہا تھا جتنا ہمیشہ لگتا تھا۔رابیل اسے پہلی بار بھی اگنور نہیں کر سکی تھی وہ آج بھی نظر انداز ہونے والوں میں نہیں تھا۔

''میرے بارے میں۔۔۔۔ہمم۔ہم کل چار لوگ ہیں۔ماما، بابا، مزینہ آپی اور میں۔'' ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کا آغاز ہوا۔ویسے تو ان دونوں کو ہی تعارف درکار تھا پر پہل اذلان نے کی تو رابیل اپنے متعلق بتانے لگی۔

''بابا بہت دلچسپ انسان ہیں۔ایک انتہائی قابل پروفیسر ہونے کے باوجود بہت مختلف اور غیر سنجیدہ۔ماما کہتی ہیں مجھے بگاڑنے میں سو فیصد ہاتھ بابا کا ہے۔ان کے ہوتے گھر میں کوئی سنجیدہ اور خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ہر وقت شرارتیں اور ہنسی مذاق۔ان کی وجہ سے گھر گھر لگتا ہے۔

زندگی زندگی لگتی ہے۔" اذلان کا چہرہ سنجیدہ اور بے تاثر تھا۔رابیل کے گالوں کی لالی گہری ہورہی تھی۔ مسکراہٹ بدستور اس کے ہونٹوں کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔اپنی خوبصورت زندگی کے متعلق بتاتے اس کی آنکھوں میں جگنو تھے۔ایک آسودہ زندگی کو بیان کرتے فرحت کا حسین احساس تھا جو اذلان کی نظروں سے چھپ نہیں پایا تھا۔

ویسے وہ بہت اسپورٹیو ہیں انفیکٹ میرے دونوں پیرنٹس۔۔۔آج اگر زندگی میں ہم کسی قابل ہیں، ہماری انفرادی حیثیت ہے، ہم معاشرے کے ذمہ دار شہری ہیں تو اس کا مکمل کریڈیٹ ہمارے والدین کو جاتا ہے۔"کافی کا سپ لیتے رابیل نے مزید بتایا۔اذلان کے چہرے کی رنگت بدلی تھی۔اسے عجیب وحشت نے آگھیرا تھا۔

"آئی ایم سوری"۔سامنے پڑا کافی کا کپ پرے دھکیلتے وہ خشک لہجے میں بولا۔

"جی؟"وہ جو اپنی ہی باتوں میں مگن تھی ایک دم چونکی۔

''میرا خیال ہے چلنا چاہیئے۔مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا''۔وہ ایکدم کھڑا ہو گیا۔میز پہ چند نوٹ رکھتے اس نے ویٹر کو اشارہ کیا۔قدم سے قدم ملاتی حیرت میں ڈوبی رابیل اس کے ساتھ ہی باہر نکلی۔

''میں آپ کو ڈراپ کر دوں''۔ویلے کو ٹکٹ دیتے اس نے انتہائی سنجیدہ اور کچھ کچھ اکھڑے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''شکریہ۔میرے پاس گاڑی ہے''۔اپنی اس سے زیادہ تذلیل اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔غصے میں کہتی وہ پارکنگ کی طرف چل پڑی۔

''رابیل''۔اپنے پیچھے اذلان کی آواز پہ اس نے پلٹ کر دیکھا۔وہ اس کے پاس آچکا تھا۔

''آپ بہت سادہ اور معصوم ہیں اور میں نہیں چاہوں گا کوئی آپ سے آپ کی یہ معصومیت چھین لے۔شائد ہمیں کبھی نہیں ملنا چاہیئے تھا''۔اس غیر جذباتی انسان کے ان جذباتی لفظوں کو وہ سرے سے نہیں سمجھی تھی۔وہ اسے کیا کہنا چاہتا تھا، کیا سمجھانا چاہتا تھا وہ کچھ بھی سمجھ

نہیں پائی تھی۔اس کی طرف قدم بھی اذلان نے بڑھائے تھے اور اب یہ گریز بھی اسی کی جانب سے تھا تو رابیل اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتی۔یہ شخص وہ پزل تھا جس کے سارے ٹکڑے رابیل تک پہنچے ہی نہیں تھے۔ وہ خاموش اسے دیکھتی رہی جبکہ اذلان واپس جا چکا تھا۔رابیل بھی اپنی گاڑی کی طرف چل پڑی مگر دل اس پل بوجھل ہورہا تھا۔۔۔لیکن کیوں؟

☆☆☆

''اوہ میرے اللہ، بابا آپ کو تو تیز بخار ہے؟''شکیل الدین کمرے میں آیا تو اس کا ننھا وجود بخار میں بری طرح تپ رہا تھا۔اس نے آگے بڑھ کر گود میں اٹھالیا اور پاس پڑا پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگایا۔ایک ہی گھونٹ میں اس نے پورا گلاس ختم کردیا۔

''بابا وہ نئی ماما''۔خشک لبوں پہ زبان پھیرتے وہ خوف سے بولا۔

''کیا کہا نئی ماما نے''۔شکیل الدین نے کریدا۔ضوفشاں کا رویہ اس سے چھپا ہوا تو تھا نہیں۔بس ایک وہی تھا جو دل سے ہمایوں بخت کا

وفادار تھا اور جسے آج تک ضوفشاں خرید نہ سکی تھی لیکن اس کی غربت اتنا بڑا جرم تھی کہ وہ کچھ بھی کہتا الزام اسی پہ آتا۔

''کل رات۔۔۔وہ پاپا کے کمرے میں۔۔۔انکل''۔یہاں وہاں دیکھتے بچہ سہمے ہوئے اندا میں بولا پر ضوفشاں کو دروازے پہ دیکھ کر آگے کچھ بھی کہہ نہ پایا۔

''کیا ہورہا ہے یہ سب۔اور تم اب تک اسکول کے لئے تیار کیوں نہیں ہوئے؟''تیز لہجے میں کہتی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''بیگم صاحبہ بابا کو تیز بخار ہے''۔شکیل الدین گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''بابا ٹھیک ہی کب ہوتا ہے۔روز کوئی نا کوئی مصیبت ڈالی ہوتی ہے۔سب اس کے اسکول نہ جانے کے بہانے ہیں''۔طنزیہ لہجے میں کہتی وہ اسے بری طرح گھور رہی تھی۔بچے کا تو سانس خشک ہوگیا۔

''تم نکلو یہاں سے میں خود دیکھتی ہوں اسے''۔شکیل الدین سر جھکائے باہر چلا گیا۔

''کیا بکواس کر رہا تھا اس بڈھے کو۔''ضوفشاں نے اس کا کان مروڑا۔وہ تلملایا۔

''زمین سے اگا نہیں پودنہ اور تانک جھانک شروع کر دی۔تیرا تو وہ حال کروں گی کبھی دوبارہ میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا''۔اسے بازو سے گھسیٹتی وہ باورچی خانے میں لے گئی جہاں گرما گرم چمٹے سے اس کی کمر دہکاتے اس کا دل ایک بار بھی نہیں کانپا۔کمر کی کھال جھلسنے پہ بچہ بلک بلک کر روتا فریاد کر رہا تھا لیکن اس ظالم عورت پہ ہرگز اثر نہ ہوا۔

☆☆☆

ہوٹل سے نکل کر وہ سیدھا ریس کورس چلا آیا تھا۔اے سی گاڑی سے نکل کر پگڈنڈی تک جاتے گرم ہوا کے جھونکوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔لباس جگہ سے میل نہیں کھاتا تھا پر اپنی فرسٹریشن نکالنے کی اس سے بہتر جگہ اس کے پاس نہیں تھی۔ٹریک پہ سرپٹ دوڑتے اس نے خود کو کوسا۔کتنا غلط کرنے جا رہا تھا وہ۔اپنی کم مائیگی کا بدلہ کسی ایسے

انسان سے لینا جو ہرگز اس کا قصوروار نہ ہو کہاں کی دانشمندی تھی۔پر اذلان طیب شاہ عقلمند تھا بھی کہاں۔وہ اگر عقل والا ہوتا تو آج تک ماضی میں نہ جی رہا ہوتا۔درد کو کلیجے سے لگائے کانٹوں پہ نہ چلتا۔زندگی نے اس سے اگر بہت کچھ چھین لیا تھا تو بے تحاشہ لوٹایا بھی تو تھا۔پھر بھی وہ اپنی اذیت سے باہر نکلنا نہیں چاہتا تھا۔وقت کے بے رحم ہاتھوں سے زخم کھا کر وہ گرتا پڑتا بہت دور نکل آیا تھا لیکن آج بھی اس تکلیف کے ساتھ زندہ تھا تو یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا۔رابیل ہو یا کوئی اور وہ عورتوں سے شدید نفرت کرتا تھا تو یہ اس کی چوائس تھی۔رابیل اس کی مجرم نہیں تھی۔

’’اپنے جنون میں بہت برا کرنے جارہا تھا میں اس کے ساتھ۔ میرے جیسے ادھورے انسان کو کوئی حق نہیں پہنچتا اپنے زخموں کا بدلہ کسی ایسے انسان سے لے جو میرے درد کی وجہ نہیں‘‘۔

وہ اسے تکلیف پہنچانے کا سوچ رہا تھا پر وہ ایسا کر نہیں پایا تھا۔اس سے خوشیاں چھینی گئی تھیں لیکن وہ رابیل کی خوشیاں چھین نہیں سکتا تھا اور

شائد وہ اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔خود سے اعتراف کرنا مشکل تھا۔۔بہت مشکل۔کیونکہ اعتراف پتھریلی چٹانوں پہ برہنہ پاء چلاتا ہے۔صحرا میں دودھ کی نہر کھدواتا ہے۔گیروا لباس پہن کر خیر مانگواتا ہے۔کچے گھڑے پہ چناب پار کراتا ہے۔یہ عشق آساں نہیں ہوتا اس کے لئے بڑی قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔

☆☆☆

''رابیل''۔سکندر حسین کمرے میں داخل ہوئے تو وہ صوفہ پہ پاؤں لپیٹے سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھی تھی۔

''جی بابا۔۔جی''۔اس نے سر اٹھایا۔

''کیا ہوا یہ سورج آج مغرب سے طلوع ہوا تھا کیا۔تم گھر میں ہو اور اتنی خاموشی''۔وہ متفکر ہوئے۔

''اچھا آپ کا کہنے کا مطلب ہے گھر میں شور میری وجہ سے ہوتا ہے''۔مسکراتے ہوئے اس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

''معاملہ واقعی سنجیدہ ہے۔بابا کو نہیں بتاؤ گی''۔اس کے پاس بیٹھتے انہوں نے محبت سے سوال کیا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ''۔حالانکہ مسئلہ نہیں مسائل تھے پر اس نے بات گول کرنا چاہی۔

''تو پھر یہ چہرے پہ بارہ کیوں بجے ہیں''۔وہ اسے اس سے بہتر سمجھتے تھے۔ وہ کبھی اتنی خاموش اور سنجیدہ نہیں رہتی تھی۔

''بابا وہ ڈاکٹر عاصم ہیں نا۔۔۔انہوں نے مجھے پرپوز کیا ہے''۔ان کے زور دینے پہ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ہاں تو اس میں اتنی پریشانی والی کون سی بات ہے۔اس بیچارے کے کون سے سارے پیچ کسے ہوئے ہیں''۔کوئی اور وقت ہوتا تو اسے غصہ آجاتا پر اب تو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔ایک اذلان والا معاملہ بھی آج کیا کم ٹینشن والا تھا کہ عاصم نے نیا کھاتہ کھول دیا۔رابیل نے اسے ایک دوست کے سوا کبھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔یہ ایک غیر متوقع بات تھی

جس نے اسے واقعی بوکھلا دیا تھا۔انکار کرتی تو دوستی اثر انداز ہوتی اقرار پہ دل نہیں مانتا تھا۔

''ویسے میرے حساب سے خاصہ معقول انسان ہے اور ہمارا دیکھا بھالا بھی ہے۔رشتہ قبول کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں''۔سکندر حسین نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن بابا۔۔۔''رابیل نے احتجاج کرنا چاہا۔

''کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو''۔سکندر حسین بات کو گھما پھرا کر کرنے والوں میں سے نہیں تھے اور یہی صاف گوئی وہ اپنے بچوں سے بھی چاہتے تھے۔

''میں بس ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی''۔رابیل نے نظریں چرائیں۔

''دیکھو رابیل میں ان والدین کے سخت خلاف ہوں جو اولاد پہ اپنی مرضی حکم کی طرح نافذ کرکے ان کی زندگیوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے راستے بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔میں سمجھتا ہوں میں تم دونوں کو اتنا کچھ تو سکھا ہی چکا ہوں کہ زندگی میں

اپنے لئے فیصلہ لیتے تم کنفیوز نہ ہو۔دوسرے مروت میں آکر جھوٹ بولنا یا اپنی مرضی کے خلاف زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔یوں سمجھو کانٹوں پہ چلنا پڑتا ہے۔آسان راستہ ہمیشہ سچ کا ہوتا ہے۔سیدھا اور کھرا۔۔۔۔۔اس کے بعد تم جو چاہو گی اور جیسے چاہو گی میں تمہارے ساتھ ہیں"۔کتنی آسانی سے وہ اسے دریا پار کرا گئے تھے۔'

'تھینکس بابا۔آپ نے سچ میں میرا مسئلہ حل کردیا ورنہ میں یہی پریشان ہورہی تھی ڈاکٹر عاصم کو انکار کیسے کروں۔وہ میرے بہت پرانے اور بہت اچھے دوست ہیں میں چاہتی ہوں ہمارے درمیان یہ تقدس قائم رہے"۔اگر والدین بچوں کے دوست بن کر ان کے مسائل کو سمجھیں اور پھر ان کی جگہ خود کو رکھ کر مشورہ دیں تو آدھے مسئلے تو یونہی نبٹ جاتے ہیں۔وہ بھی فیصلہ کر چکی تھی اور اب واقعی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

' 'چلو یہ معاملہ حل ہوا۔اب اس کے متعلق کب بتاؤ گی؟"رابیل کی طرف بغور دیکھتے انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اس کی شائد ضرورت نہ پڑے''۔رابیل نے لب کاٹتے سر جھکایا۔دل میں ایک ٹیس اٹھی تھی۔روح بے چین ہوئی تھی پر اس نے لب بھینچ لئے۔

☆☆☆

اس کی جرمنی سے آمد ایک ہفتہ تاخیر سے ہوئی تھی۔اس دوران ضوفشاں اور سفیان کو من مانی کرنے کا بھرپور موقع مل گیا تھا۔باپ کو دیکھ کر اسے ملتے ہوئے بچہ پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا جسے ضوفشاں نے اس کی طویل غیر موجودگی سے کور کرنے کی کوشش کی۔بہرحال بچے کی گرتی ہوئی صحت اور اس کا گم صم انداز اسے چونکا گیا تھا تو دوسری طرف شکیل الدین کا اچانک غائب ہوجانا بھی اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

''میرے کئی بار ٹوکنے کے باوجود شکیل الدین اس معصوم سے ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا تھا۔وہ تو بھلا ہو سفیان کا جو اس نے دیکھ لیا اور لگائیں دو تو بھاگ گیا خبیث''۔اداکاری تو یوں بھی اس پہ ختم تھی۔لہجے

میں درد، آنکھوں میں آنسو لائے ہمایوں کے پاس بیٹھی وہ مکاری سے بولی۔

''کمال ہے ، ایسا تو نہیں لگتا تھا۔سالہا سال سے میرے اعتبار کا آدمی تھا''۔ہمایوں بخت کو اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کا اتنا پرانا ملازم اس کے بیٹے کے ساتھ اتنا ظالمانہ سلوک کرتا ہو گا پر وہ دونوں جس اعتماد سے جھوٹ بول رہے تھے اس کے پاس یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''آپ نے کچھ زیادہ ہی چھوٹ دے رکھی تھی اسے، ملازم یونہی تو من مانی نہیں کرتے نا اور میں کیا جھوٹ بول رہی ہوں۔پیٹھ دیکھیں اس کی کیسے ظالم نے برا حال کیا ہے میرے معصوم بچے کا''۔ضوفشاں نے برا سا منہ بناتے بچے کی قمیض سے کپڑا اٹھایا جہاں جلنے کے نشانات نمایاں تھے۔نرم جلد بری طرح جھلسی ہوئی تھی۔

''مار پیٹ کرنے کی بجائے سیدھا پولیس میں دینا چاہیئے تھا اسے باقی میں خود دیکھ لیتا''۔ہمایوں بخت کا غصے سے برا حال ہو گیا۔اس کا تو

اب بس نہیں چل رہا تھا شکیل الدین اس کے سامنے ہوتا تو وہ اسے لمبی چوڑی سزا دلواتا۔بچہ گم صم سا باپ سے چمٹا کن انکھیوں سے اپنے مجرموں کو دیکھتا رہا۔

''بھائی جان میں بھی یہی کرنے والا تھا۔وہ قصائی موقع ملتے ہی فرار ہوگیا''۔سفیان میسنے انداز میں بولا۔ہمایوں بخت اس سے زیادہ مزید کیا ردِعمل دکھاتا۔اسے تو بس اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی غفلت اور ملازموں پہ ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے کا خمیازہ اس کے بیٹے کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔سفیان اور ضوفشاں اب مطمعن تھے کیونکہ ان کی بات پہ ہمایوں یقین کر چکا تھا اور انہیں کیا چاہیئے تھا۔تکمیل کے مرحلے پہ پہنچ کر ان کا پلان ناکام ہوجائے ایسا انہوں نے کہا سوچا تھا لہذا اس کی زبان بندی نہایت ضروری تھی۔بچے کو جسمانی تشدد کا نشانہ بناکر اسے ڈرا دھمکا دیا گیا تھا۔ضوفشاں کی ویسے بھی اس پہ کڑی نگاہ تھی مگر شکیل الدین بھی اب ضرورت سے زیادہ جان چکا تھا۔وہ فقط زبان بندی تک محدود نہ رہ پاتا اسے راستے سے ہٹانا نہایت ضروری تھا اور سفیان شوکت نے اسے

ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا دیا تھا۔کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی تھی الٹا اس غریب پہ چوری اور تشدد جیسے گھناؤنے الزام لگا کر اس کی کردار کشی کی گئی تھی۔ بگڑی ہوئی گیم ایک بار پھر ان دونوں کے ہاتھ میں آچکی تھی۔

☆☆☆

رابیل اور اس کی ملاقات کو کئی ماہ بیت گئے تھے۔دوبارہ اس نے پلٹ کر دیکھا نہ رابیل نے ہی کبھی رابطہ کیا۔جنوں کی طرح محبت پہ بھی بند باندھے اذلان وہی لگی بندھی زندگی گزار رہا تھا۔رابیل سے تعلق کی ڈور جڑ کر بھی نہ جڑ پائی تھی اس کا ملال اپنی جگہ پر وہ اس کے قابل نہیں یہ اطمینان اس کی بے چینی کو قرار دیتا تھا۔ان دونوں کی پہلی ملاقات ایک اتفاق ، ایک حادثہ تھا اور دل میں خواہش پیدا ہوتی کاش کبھی اچانک اتفاق سے ہی اس سے دوبارہ ملاقات ہوجائے۔ویسے تو اذلان پہلے کی طرح اتفاق پلان کر سکتا تھا پر وہ اب ایسا چاہتا نہیں تھا۔

چھٹی کا دن تھا۔وہ گھر پہ ہی موجود تھا۔لاؤنج میں آیا تو مسز شاہ ٹی وی کی طرف متوجہ تھیں۔نیوز چینل لگا تھا۔اسے بیٹھتا دیکھ کر انہوں نے ریموٹ سے والیم آہستہ کیا۔وہ ٹی وی بہت کم دیکھتا تھا سوائے بزنس نیوز کے اسے باقی کسی بات میں دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔باقی حالاتِ حاضرہ کا پتا تو اخبار اور انٹرنیٹ سے چل جاتا تھا۔

''یہ بھی عجیب سلسلہ چل نکلا ہے۔سب کام چھوڑ کر دھرنوں کے ذریعے مطالبات منوانے کا یہ بھلا کون سا طریقہ ہے۔کون کہے گا یہ ہمارا ٹاپ پروفیشنل طبقہ ہے''۔تنخواہوں میں اضافے سے متعلق ڈاکٹروں کی ہڑتال کی فوٹیج ٹی وی پہ دکھائی جا رہی تھی۔بینر اور پوسٹر اٹھائے بہت سے لوگ اسکرین پہ نظر آرہے تھے۔ان کی بات پہ اذلان نے اسکرین پہ نگاہ کی۔انہوں نے ٹی وی آف کرنا چاہا۔

''رابیل۔۔۔''وہ آنکھیں سکیڑے حیرت سے بولا۔مسز شاہ کا ہاتھ تھم گیا۔

''کون رابیل۔۔۔تم ان میں سے کسی کو پرسنلی جانتے ہو''۔ان کے سوال پہ وہ لب کاٹتے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اذلان کہاں جا رہے ہو میری بات تو سنو''۔انہیں کوئی بھی جواب دیئے بغیر وہ تیزی سے باہر نکل گیا وہ پیچھے سر پکڑ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

وہ ضرورت سے زیادہ محتاط انسان تھا ڈرائیو بھی احتیاط سے کرتا تھا لیکن آج وہ اپنے ہی قاعدے کے الٹ بے تحاشہ تیز گاڑی دوڑاتا اس کے گھر پہنچا تھا۔وہ سب لائیو نہیں تھا اور رابیل اسوقت اپنے گھر پہ ہی تھی۔اسے کال کرکے باہر بلایا گیا۔وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ اکھڑے ہوئے موڈ کے ساتھ اس نے اسے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔رابیل کے لئے یہ مزید حیرانی کی بات تھی۔بہرحال وہ گاڑی تک اس کے ساتھ چلی آئی۔جیسے ہی وہ گاڑی میں بیٹھی اذلان نے کار چلا دی۔

''میں تمہیں ایک سلجھی ہوئی عقلمند انسان تصور کرتا تھا''۔ڈرائیو کرتے اس نے اسٹئیرنگ پہ ہاتھ مارا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا میں بیوقوف ہوں''۔رابیل کو اس کا انداز سلگا گیا تھا۔

''حرکتیں تو کچھ ایسی ہی کر رہی ہو''۔وہ مزید تپا۔

''آپ حد سے بڑھ رہے ہیں مسٹر شاہ''۔رابیل نے ٹوکا۔

''اور جو تم کر رہی ہو وہ سب تو بالکل ٹھیک ہے''۔اس طنز کا مفہوم وہ اب تک نہیں سمجھ پائی تھی۔

''کیا کیا ہے میں نے ''۔اس نے باقاعدہ احتجاج کیا۔

''سڑکوں پہ بینر اٹھا کر ٹکے ٹکے کے لوگوں کے سامنے اپنا تماشہ بنوانا اور پوری دنیا میں اپنے پروفیشن اور اپنے ملک کی رسوائی کرنا تو انتہائی قابلِ تحسین عمل ہے انفیکٹ اس پہ تو کھڑے ہوکر تالیاں بجانی چاہیئں''۔پتا نہیں اسے کیوں اتنا غصہ آرہا تھا۔رابیل کو اس حق جتانے پہ حیرت ہوئی۔

''آپ تصویر کا فقط ایک رخ دیکھ کر رائے دے رہے ہیں۔آپ کو احساس ہی نہیں ان مسائل کا جو ہم برداشت کرتے ہیں اور بدلے میں

ہمیں ملتا کیا ہے"۔رابیل نے دفاع کیا۔اذلان طنزیہ ہنسا۔گاڑی اب ریس کورس کی پارکنگ میں پارک ہوچکی تھی۔

''تو کیا بس ایک یہی واحد راستہ ہے۔تم عورتوں کا مسئلہ ہی یہ ہے۔عقل سے پیدل ہوتی ہو سب کی سب اور خود کو عقلِ کل سمجھتی ہو۔معاشرے نے آزادی کیا دے دی اپنا تقدس، اپنی حیا چھوڑ کر سڑکوں تک پہنچ گئی ہو بھلے گھر میں باپ بھائی کا سر شرم سے جھک ہی کیوں نہ

جائے۔اتنا بھی نہیں سمجھتی عورت کے پاس اگر حیا نہ رہے تو باقی کچھ نہیں بچتا"۔اذلان بس کہتا چلا گیا۔

''آپ ہوتے کون ہیں مجھ سے ایسی بات کرنے والے۔اور کیا بے حیائی کر رہی تھی میں بتائیں۔۔۔اپنے حق کے لئے آواز اٹھانا کوئی غلط بات نہیں"۔ٹریک پہ وہ دونوں ساتھ ساتھ تیز قدموں سے چلتے جا رہے تھے۔رابیل نے دفاع کیا پر اذلان متفق نہ تھا۔

''آواز اٹھانا غلط نہیں یہ انداز غلط ہے اور میں تمہیں اس طرح سڑکوں پہ تماشہ لگانے کی اجازت نہیں دوں گا''۔وہ انتہائی سنجیدہ اور دو ٹوک بولا۔

''آپ کا مسئلہ کیا ہے اور آپ ہیں کون ہیں مجھ پہ یہ دھونس جمانے والے۔میں جو مرضی کروں جیسے مرضی زندگی گزاروں آپ کا مجھ سے کیا تعلق؟''چلتے چلتے رابیل ایک دم اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔سینے پہ ہاتھ باندھے اس نے ناراض لہجے میں پوچھا تو ازلان یک ٹک اسے دیکھے گیا۔چند پل خاموشی کے گزرے۔اس کی خود پہ جمی نگاہوں سے پریشان رابیل نے نظریں جھکا دیں۔

''یہ تو تم اپنے دل سے پوچھو رابیل جواب وہی آئے گا جو اس پل میری آنکھوں میں۔آئی لو یو ڈیم اٹ اور میں اس طرح تمہیں خود کو کسی مشکل میں ڈالنے کے لئے نہیں چھوڑ سکتا''۔اس کا ہاتھ تھامتے ازلان دھیمے لہجے میں بولا تو رابیل کی سانسیں تھم گئیں۔یہ انکشاف ناقابلِ یقین تھا۔کبھی بھی ہوتا وہ یونہی سن رہ جاتی جیسے آج اور ابھی ہوئی تھی۔

’’تو پھر مت چھوڑیں۔۔۔‘‘بھوری آنکھوں نے سیاہ آنکھوں میں دیکھتے فرمائش کی اور اس کے آگے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔لفظوں کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ خاموشی ہمکلام تھی۔خزاں میں بہار کا منظر بکھر گیا تھا۔

☆☆☆

اسے بھولنا آسان نہ تھا پر بھولنا تو کچھ بھی آسان نہیں ہوتا اور اذلان تو یوں بھی مشکل پسند تھا۔مشکلوں کے ساتھ جینا اس کی فطرت تھی تو یہ مشکل بھی سینے سے لگا لی۔اس عام سی لڑکی نے بڑی خاص جگہ بنائی تھی اذلان کے دل میں جو اتنی آسانی سے تو بدل نہیں سکتی تھی۔وہ اسے چاہنے لگا تھا اور آج اسے ایک بار پھر اپنے سامنے دیکھ کر وہ خود کو اظہار سے روک نہیں پایا تھا۔رابیل سے کہہ چکا تھا تو پھر ان سے کہنا کون سا مشکل تھا۔

’’یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔آخر میری زندگی میں بھی وہ دن آ ہی گیا جس کا مجھے کب سے انتظار تھا۔ویسے مجھے یقین ہے وہ لڑکی بہت

خاص ہوگی جس نے میرے بیٹے کے دل کے بند دروازوں کو کھول لیا"۔حسبِ توقع وہ خوشی سے نہال ہوگئ تھیں۔

''بس اب جلد سے جلد میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔ کل ہی اس کے گھر والوں سے مل کر تمہارے رشتہ کی بات کرتی ہوں"۔ان کے تو دل کی مراد بر آئی تھی۔جب وہ مان چکا تھا تو پھر انہیں کون روک سکتا تھا۔بس اب وہ جلد از جلد اپنی بہو کو گھر لانا چاہتی تھیں۔

''میں رابیل سے شادی کا فیصلہ کر تو چکا ہوں پر یہ سوچ کر خوف بھی آرہا ہے کہ میں یہ تعلق نبھا پاؤں گا یا نہیں"۔اذلان کی الجھن سے وہ اب بھی ناواقف تھیں۔

''خود کو انڈراسٹیمیٹ کرنا چھوڑ دو اذلان۔۔۔تم میں کوئی کمی نہیں ہے۔تم ہر رشتہ بخوبی نبھانے کی صلاحیت رکھتے ہو اور ہر طرح سے لائق ہو۔زندگی میں خوشیوں کو تم سے زیادہ شائد ہی کوئی دوسرا ڈیزرو کرتا ہے"۔انہوں نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔اسے رسانیت سے سمجھایا۔

''میرا دل نا چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف مائل ہے۔میں یہ سب نہیں چاہتا تھا لیکن اس سے محبت میرے اختیار میں نہیں۔میری طاقت، میرا کنٹرول ایک لڑکی کی محبت میں مجھے بیس سال پہلے والی کیفیت میں لے گیا۔میں اس وقت بھی بے بس تھا میں آج بھی بے بسی کی انتہا پہ ہوں''۔بس ایک وہی تھیں جن کے سامنے وہ کھلی کتاب تھا۔ جو بناء کہے بھی سب جانتی تھیں۔ان سے بڑھ کر اس کا رازداں اور کون تھا۔آج اگر وہ کچھ تھا تو انہی کی بدولت۔ان سے اپنے دل کا حال کہنا اس لئے بھی مشکل نہیں تھا کیونکہ وہ اسے اس سے بڑھ کر سمجھتی تھیں۔

''اسی کو قسمت کہتے ہیں۔جو ہوچکا وہ مقدر میں ایسے ہی لکھا تھا۔ جو ہورہا ہے اسے ہوجانے دو کیونکہ یہ تمہاری تقدیر میں ہے اور میری ایک بات یاد رکھنا اذلان، ہماری تقدیر بنانے والا ہم سے بہت محبت کرتا ہے۔برے کو بھول کر اچھے کی طرف دیکھو۔میری دعا ہے تم رابیل کے ساتھ بہت خوش رہو گے''۔وہ محبت سے سمجھاتی رہیں۔

’’لیکن کیا وہ بھی میرے ساتھ خوش رہ پائے گی؟‘‘اس پل وہ انہیں بہت معصوم لگا تھا جو یقین اور بے یقینی کے درمیان سفر کر رہا تھا۔

’’تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہو گے‘‘۔انہوں نے یقین دلایا۔

☆☆☆

رابیل کے لئے اذلان طیب شاہ کا رشتہ آنا شگفتہ بیگم کو بوکھلا گیا تھا۔ البتہ مزینہ بے تحاشہ خوش تھی۔اذلان میں رابیل کی دلچسپی اس کے علم میں تھی اور شائد سکندر حسین کو بھی اس بات کا اندازہ تھا۔رابیل کے مزاج کے اتار چڑھاؤ اور اس کی خاموشی ان سے چھپی ہوئی تو تھی نہیں۔

’’میری تو سمجھ سے باہر ہے یہ سب‘‘۔شگفتہ بیگم کو اس رشتے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

''تو اس میں آپ کی سمجھ کا قصور ہے ورنہ بات تو شیشے کی طرح صاف ہے''۔سکندر حسین نے بے ساختہ ٹوکا۔

''شادی بیاہ اپنے برابر کے لوگوں میں ہی ٹھیک رہتے ہیں۔ان لوگوں کے اور ہمارے کلاس ڈفرنس میں زمین آسمان کا فرق ہے''۔ان کی بات بھی مناسب تھی۔وہ بہت سوچ سمجھ کر بات کر رہی تھیں اور انہیں اپنی بیٹی کا مستقبل بہت عزیز تھا۔

''تخلیقِ کائنات سے یہ زمین اور آسمان یونہی نظامِ کائنات کا حصہ ہیں۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ زمین تو تھی پر آسمان غائب ہوگیا''۔سکندر حسین بھی ڈٹ گئے۔رابیل اور مزینہ خاموش تھیں۔

''کائنات کا حصہ ضرور ہیں لیکن کبھی ملے نہیں اور قیامت تک مل نہیں پائیں گے''۔شگفتہ بیگم کی بات پہ رابیل نے لب کاٹے۔اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

''شگفتہ بیگم اپنی بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھیں اور یہ بات اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہیں۔''سکندر حسین نے ایک نظر رابیل کے اداس چہرے کو دیکھا۔رابیل نے سر جھکا لیا۔

''پھر بھی میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔وہ بہت اونچا گھرانہ ہے ہمارا ان کا کیا مقابلہ''۔شگفتہ بیگم نے پسپائی اختیار کی بہرحال اس کی خوشی تو انہیں بھی عزیز تھی۔

''کوئی کشتی نہیں لڑنی ہم نے بیٹی بیاہنی ہے۔''سکندر حسین تلملا کر بولے۔

''رابیل کی شادی وہاں ہوگی جہاں وہ چاہتی ہے۔اس سلسلے میں آپ یا میں اس پہ بالکل کوئی دباؤ نہیں ڈالیں گے۔فیصلہ ہوچکا''۔آخری فیصلہ تو بہر حال ان کا ہی ہونا تھا جو وہ کر چکے تھے اب اس سے آگے شگفتہ بیگم بھی خاموش ہوگئیں۔مزینہ نے چہک کر رابیل کو گلے لگالیا جو بابا کی طرف دیکھتی دھیما سا مسکرائی تھی۔

☆☆☆

وہ دسمبر کی ایک خنک رات تھی۔شام سے ہی آسمان پہ گہرے بادل چھائے تھے اور اب موسلادھار مینہ برس رہا تھا۔کھڑکیوں کے مہین ریشمی پردوں سے تواتر سے برستی بارش کی بوچھاڑ اور بجلی کی چمک جھانکتی دل میں ہلچل مچاتی تھی۔کمرے کا دروازہ کھلا اور سیاہ لباس میں ملبوس وہ اپنی ازلی سنجیدگی اور وقار سے چلتا آبنوسی پلنگ تک پہنچا جہاں سرخ کامدار قیمتی لباس میں سر جھکائے رابیل بیٹھی تھی۔اذلان کے قدموں کی آہٹ اپنے قریب پاکر رابیل کی گھنی پلکوں میں ارتعاش ہوا۔کوٹ کے بٹن کھولتا وہ اس کے بالکل سامنے جا بیٹھا۔رابیل نے نظریں نہیں اٹھائیں۔اس کی گود میں دھرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے کچھ دیر وہ اس کی مہندی لگی ہتھیلی کو دیکھتا رہا اور پھر ایک ہیروں جڑی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی۔رابیل محتاط سی اب بھی اسے دیکھنے سے گریزاں تھی۔اپنے ہاتھ کی انگلی سے انگوٹھی پہ دائرے بناتے وہ اب بھی خاموش تھا جیسے گہری سوچ کے حصار میں ہو۔ایک گہرا سانس لیتے اس نے رابیل کی انگوٹھی کو لبوں سے چھوا۔وہ کچھ اور چوکنی ہوئی۔اذلان اب اس کے

جھکے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔سجا سنورا دلکش روپ دل میں اترتا روح پہ دستک دے رہا تھا۔بے اختیار اس نے رابیل کی سنہری بندیا کو چھوا۔ اسے درست کرتے ماتھے پہ جمایا۔انگلی پہ اس کی آوارہ لٹ کو گھماتے وہ بدستور رابیل کو دیکھ رہا تھا۔اس کی قربت کا احساس رابیل کو بے اختیار کر رہا تھا۔آنکھیں بھینچے اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔اذلان نے ہاتھ کھینچ لیا۔ رابیل منتظر تھی پر وہ خالی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔اچانک وہ تیزی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔دروازہ بند ہونے کی آواز پہ چونک کر رابیل نے آنکھیں کھولیں۔وہ تنہا تھی۔اذلان جاچکا تھا۔

☆☆☆

شکیل الدین کی موت کے بعد ایک بارپھر وہ دونوں تسلی سے اپنے کام میں جت گئے تھے۔معاملہ کنٹرول میں تھا اور اب اگلا مرحلہ تھا ہمایوں بخت کو راستے سے ہٹانا اور اس کی دولت جائیداد پہ قبضہ کرنا۔گھر پہ ضوفشاں اور دفتر میں سفیان۔۔۔۔ہمایوں ان کے جال میں برا پھنسا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ انتہائی خاموشی سے ضوفشاں نے ہمایوں کو دودھ میں وہ

زہر ملا کر دینا شروع کردیا تھا جس کے اثرات آہستہ آہستہ اس کی صحت پہ دکھائی دینے لگے تھے۔جسمانی نقاہت اور تناؤ بڑھتا جارہا تھا جس کے باعث وہ اکثر اب دفتر جانے کی بجائے گھر پہ آرام کرتا۔سفیان سیاہ و سفید کا مالک بنا اس کی بیماری کا فائدہ اٹھاکر جس بھی کاغذ پہ چاہتا اس کے دستخط حاصل کرلیتا۔بس اب یہ ہوا کہ ہمایوں کے گھر پر رہنے کی بدولت بچے پہ عتاب کم ہونے لگا تھا لیکن اب ضوفشاں کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔بچہ اس کے سایے سے خوف کھاتا تھا۔کچھ باپ کی بیماری اور اس کے بستر پہ لگنے سے وہ اور بھی ہراساں تھا۔ڈاکٹر بھی اپنا تھا لہذا ٹیسٹ وغیرہ میں تو سب کلئیر نکلتا پر ہمایوں کی زندگی ہاتھ سے نکلے جارہی تھی۔سفیان اب تک تقریباََ ہر اس ضروری کاغذ پہ ہمایوں سے دستخط کروا چکا تھا جن کی بدولت پاور آف اٹارنی اس کو منتقل ہوچکی تھی۔ان دونوں کو اب اور چاہیئے بھی کیا تھا لہذا گھر میں بھی کھل کر ضوفشاں کا کردار سامنے آنے لگا۔وہ اب کم ہی ہمایوں پہ توجہ دیتی اور جلی کٹی باتوں سے اپنی بھڑاس نکالتی۔ہمایوں کو افسوس ہوتا پر وہ اسے

اپنی مستقل بیماری سے منتھی کرتا پھر بھی اس نے ضوفشان کے متعلق کوئی منفی رائے اس وقت تک قائم نہیں کی تھی جب تک خود اس کی تصدیق نہ ہو گئی۔

☆☆☆

وہ رات ان دونوں نے الگ الگ کمروں میں تنہا جاگ کر گزاری تھی۔ رابیل کے لئے اذلان کا رویہ شاکنگ تھا۔محبت کا دعوی کر کے اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانے والے کا یہ گریز اسے بالکل سمجھ نہیں آیا تھا۔تمام رات وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوتی رہی آخر ایسی کیا وجہ ہوئی کہ وہ کچھ بھی کہے بناء وہاں سے اٹھ کر چلا گیا حالانکہ وہ جب آیا تو بالکل ٹھیک تھا۔صبح تک دماغ سوچوں کے انبار سے شل ہو رہا تھا پر جواب صرف اذلان کے پاس تھا۔جاگ جاگ کر سر میں درد الگ ہو رہا تھا۔وہ بیڈ پہ بے ترتیب سی لیٹی تھی۔کپڑے بھی وہی رات والے پہن رکھے تھے جب کمرے کا دروازہ کھلا اور اذلان اندر آیا۔رابیل یکدم سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''نیند ٹھیک آئی رات کو؟'' وہ خود بھی رات والے شکن آلودہ لباس میں تھا۔ٹائی اور کوٹ البتہ غائب تھے۔آنکھوں کی لالی بے خوابی کی چغلی کھاتی تھی۔بال بکھرے ہوئے تھے۔لہجہ نارمل تھا پر یہ تو وہی جانتا تھا اندر کیا وحشت برپا ہے۔رابیل کو حیرت ہوئی۔تو کیا اپنے اس عجیب و غریب عمل پہ اسے کوئی صفائی نہیں دینی چاہیئے تھی۔

''آپ کہاں تھے''؟ رابیل نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کچھ مصروفیت تھی۔تم فریش ہوجاؤ ممی ناشتے پہ انتظار کر رہی ہوں گی''۔بڑا نپا تلا اور دو ٹوک انداز تھا۔رابیل کی مزید کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نا ہوئی کجا شکوہ شکایت کرنا۔وہ خود اس کی طرف دیکھے بناء واش روم میں گھس گیا۔تھکے تھکے انداز میں رابیل بستر سے اٹھی اور وارڈروب سے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔نئ زندگی کی پہلی صبح اتنی الجھی ہوئی بھی ہوسکتی تھی اس نے کہاں سوچا تھا لیکن شائد یہ تو ابھی شروعات تھی اس مشکل سفر کی جس کا انتخاب رابیل نے انجانے میں کر لیا تھا۔

☆☆☆

ولیمہ کے فنکشن کے بعد رسم کے طور پہ رابیل کو شگفتہ بیگم اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔وہاں سے اس کی واپسی دو دن بعد ہوئی تھی۔ازلان نے ہی اسے اس کے گھر سے رات کے کھانے کے بعد پک کیا تھا۔آلیو گرین خوبصورت کڑھائی والے قیمتی سوٹ پہ ہلکی سی ڈائمنڈ جیولری پہنے وہ بہت خاص لگ رہی تھی۔تمام راستے ازلان کا موڈ نہایت خوشگوار تھا۔بات چیت زیادہ رابیل ہی کرتی رہی کیونکہ ازلان بہرحال باتوں میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، وفطرتاََ کم گو تھا جبکہ رابیل کے پاس سنانے کے لئے دنیا جہان کی باتیں تھیں۔اسے رابیل کو سننا اچھا لگ رہا تھا۔زندگی میں اس نئے رنگ کا اضافہ حسین لگ رہا تھا۔راستے میں اس کی فرمائش پہ آئسکریم اور کافی انجوائے کرنے کے بعد وہ دونوں رات کو کافی دیر سے گھر پہنچے تھے۔

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی رابیل اپنی جیولری اتار رہی تھی جب اس نے شیشے میں اپنے پیچھے کھڑے ازلان کو دیکھا اور دھیما سا مسکرائی

تھی۔اس کو دیکھتے ہوئے اذلان نے اپنا قیمتی ونڈو پین سیاہ کوٹ اتار کر بیڈ پہ پھینکا تھا اور اسی وقت لائٹ چلی گئی۔

''اوہ مائی گاڈ''۔خوف سے رابیل کی دبی دبی چیخ نکل گئی اور گھبرا کر پلٹتے وہ اپنی پشت پہ کھڑے اذلان سے لپٹ گئی۔وہ اس کے سینے پہ سر ٹکائے خوف سے کانپ رہی تھی۔اذلان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔یوں لگا جلتے ہوئے انگارے ہیں جو اسے اندر تک سلگا رہے ہیں۔وہ شدید اذیت کا شکار تھا۔کچھ دیر وہ یونہی اس سے لپٹی رہتی تو یقیناً وہ تکلیف سے مر جاتا۔

''رابیل''۔بے اختیار ہوکر اس نے اسے خود سے الگ کرتے پیچھے دھکیلا تھا۔

''آؤچ''۔فضا میں رابیل کی سسکی گونجی۔اگلے ہی پل کمرے میں روشنی ہوگئی تھی۔چند سکینڈ لگے تھے اذلان کو خود کو سنبھالنے میں۔ آنکھیں اندھیرے کے بعد روشنی کی عادی ہوئی تو اس نے رابیل کو دیکھا

جو نیچے بیڈ کے پاس گری پڑی تھی اور ہتھیلی سے پیشانی تھام رکھی تھی۔ وہ بے یقینی سے اذلان کو دیکھ رہی تھی جو خود سن کھڑا تھا۔

''آئی ایم سو سوری رابیل''۔رابیل کی پیشانی سے رستے خون پہ نگاہ پڑی تو ہوش میں آیا تھا۔نیچے جھک کر اس نے تاسف سے معذرت کرتے اس کا ہاتھ نرمی سے پیشانی سے جدا کیا تھا۔وہاں قریب ڈیڑھ انچ کا کٹ تھا جو یقیناً اندھیرے میں بیڈ کے میٹل کونے سے ٹکرانے کے باعث لگا تھا اور جہاں سے اچھا خاصہ خون نکل رہا تھا۔

''آئی ڈونٹ مین ٹو ہرٹ یو۔میں بینڈیج کر دیتا ہوں''۔شرمندگی سے کہتے اس نے زخم کو ہلکا سا دبایا تاکہ خون رک جائے۔رابیل نے ایک دم اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی اذلان اتنی سی بات پہ اتنا برا ردِعمل کر سکتا ہے۔

''کوئی ضرورت نہیں میں خود کرلوں گی''۔تکلیف اتنی شدید تھی کہ آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔اپنی ہتھیلی سے آنکھوں کے نم گوشے رگڑتی وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔

''میں معذرت کر رہا ہوں۔تم اس طرح اچانک میرے قریب۔۔۔۔'' اس نے آگے بڑھ کر صفائی دینا چاہی۔رابیل دو قدم پیچھے ہوئی تھی۔

''اندھیرے سے خوف آتا ہے ورنہ اتنی بے اختیار نہیں کہ اپنی حد قائم نہ کرسکوں اور نہ ہی اتنی گئی گزری ہوں کہ بہانے سے آپ کے قریب آنے کے موقعے تلاش کروں''۔وہ تلخی سے بولی تھی۔حالانکہ یہ ایک انتہائی معمولی بات تھی اس رشتے کے آگے جو ان دونوں کے درمیان تھا پھر بھی ازلان نے جس انداز میں اسے جھٹکا تھا رابیل کی انا کو یہ احساسِ توہین نگاہ نہیں اٹھانے دے رہا تھا۔اس سے پہلے کہ ازلان اپنی صفائی میں کچھ کہتا رابیل پیر پٹختی واش روم میں گھس گئی تھی۔اپنے احساسِ کم تری کا بدلہ اس نے واش روم کے قیمتی دروازے سے لیا تھا جس کے بند ہونے کی اونچی آواز پہ ازلان نے لب کاٹتے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ایک خوبصورت شام کو اپنے ہی ہاتھوں برباد کرنے کے بعد وہ مزید کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

یہ رابیل کی دوسری رات تھی جو اس گھر اور اپنے کمرے میں تنہا گزری تھی۔اذلان سے اس کی ملاقات صبح ناشتے کی میز پہ ہوئی تھی جس نے بس ایک نگاہ رابیل کے ماتھے پہ لگی بینڈیج کو دیکھا تھا۔البتہ اس کی ساس پریشانی سے اس کی چوٹ کے متعلق سوال جواب کرتی رہی تھیں۔ رابیل نے بہانی بنایا کہ اس کا پاؤں واش روم میں پھسل گیا اور دروازے سے ماتھا ٹکرا گیا۔

''یاسر!''۔اذلان کی حکمیہ آواز پہ سیکورٹی گارڈ محتاط سا دوڑا چلا آیا تھا۔

''کل رات میرے کمرے کی لائٹ کیسے گئی''۔اس کا لہجہ کافی سخت تھا۔گھر میں آٹو میٹک جنریٹر موجود تھا جو بجلی کے جاتے ہی چل پڑتا تھا تو یقیناً کوئی مکینکل مسئلہ تھا۔

''وائر کا ایشو تھا اسی لئے جنریٹر خود سے آن نہیں ہوسکا''۔گارڈر نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

''یہ مسئلہ دوبارہ نہ ہو۔ ٹیکنیشن کو بلاؤ، سیکنڈ بیک اپ ارینج کرو۔ گھر کی روشنی بند نہیں ہونی چاہیئے''۔ دو ٹوک انداز میں کہتے وہ کچھ کھائے پیئے بغیر ناشتے کی میز سے اٹھ گیا تھا۔ پیچھے رابیل نے ناراضی سے سر جھٹکا۔ کل رات کا منظر ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے منڈلانے لگا تھا۔

وہ دفتر آ تو گیا تھا پر اس کا دھیان کام میں نہیں تھا۔ صبح سے اب تک وہ آفس بوائے سے لے کر ہارون تک کو بات بے بات ڈانٹ چکا تھا۔ خود کو بارہا اپنے فیصلے پہ کوس چکا تھا جو اس نے رابیل سے شادی کی صورت کیا تھا۔ وہ محبت میں ہار تھا پر خود سے آج بھی اس کی جنگ جاری تھی۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا تھا کہ اپنی خود غرضی میں ایک معصوم لڑکی کی زندگی داؤ پہ لگا بیٹھا تھا۔ جس اذیت میں برسوں سے مبتلا تھا اس میں رابیل کو شامل کرنے کا کیا حق تھا اسے پر یہ دل تھا جس نے بے بس کر دیا تھا ورنہ اذلان شاہ نے تو کبھی مقدر سے بھی مات نہیں کھائی تھی۔

''شِٹ''۔اپنا باقی کا غصہ اس نے پیپر ویٹ پہ نکالا تھا جو شیشے کی نازک میز کو کرچی کرچی کرتا پوری طاقت سے فرش سے جا ٹکرایا تھا۔

''تم ایک بزدل اور ناکام انسان ہو اذلان شاہ تمہیں کیا حق تھا رابیل کی زندگی تباہ کرنے کا''۔اپنی مٹھیوں میں بالوں کو جکڑے اس نے خود کو دھتکارہ تھا۔

''اس سے بے تحاشہ محبت کرتا ہوں میں۔اسے دیکھتا ہو تو زندگی حسین لگنے لگتی ہے''۔دل نے صدا دی تھی۔

''ایسی محبت کس کام کی جو دوسرے کی ذات میں ادھورا پن اور تشنگی چھوڑ جائے۔خود تو جل رہے اسے بھی اپنے ساتھ اس آگ میں جلانا چاہتے ہو۔اپنے ساتھ ہوئے ظلم کا بدلہ ظلم سے لو شاہ''۔ضمیر نے جھنجھوڑا تھا۔اس نے بے بسی سے سر کرسی کی پشت پہ ٹکالیا۔

''میں رابیل کے بغیر نہیں رہ سکتا، میں اس کے بغیر کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔چاہے کچھ بھی ہوجائے میں اسے خود سے دور نہیں جانے دوں گا۔کبھی نہیں!''۔آنکھیں موندیں اس نے اعتراف کیا تھا۔

☆☆☆

''ڈنر پہ چلیں''؟ وہ گھر پہنچا تو رابیل بالکونی میں تھی۔وہ اس کے پیچھے وہیں چلا آیا تھا۔بالکونی سے لان اور ڈرائیو وے صاف نظر آتا تھا یقیناً وہ اس کی گھر آمد سے باخبر تھی۔اسے نظر انداز کرتے رابیل اب بھی بس سامنے دیکھ رہی تھی۔اذلان نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر اسے کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

''کچھ کہہ رہا ہوں میں''۔رابیل نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔وہ صلح جو انداز میں مسکرایا تھا۔

''میرا موڈ نہیں''۔سپاٹ لہجے میں کہتی وہ سائیڈ سے نکل کر کمرے کی طرف بڑھی۔

''رابیل میں پوچھ نہیں رہا بتا رہا ہوں اور میں اپنی بات دہرانے کا عادی نہیں''۔اس نے ایکدم اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔لہجہ سنجیدہ لیکن دوستانہ تھا۔

''آئی ایم سوری میں آرڈر نہیں لے سکتی''۔رابیل نے کندھے اچکاتے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

''ریکوئسٹ تو ایکسیپٹ کر سکتی ہو؟'' پیشانی کے زخم کو دو انگلیوں سے چھوتے اس نے تاسف سے اس گہرے کٹ کو دیکھا تھا جہاں سے اب بھی ہلکا سا خون رِس رہا تھا۔پر اب وہ حصہ بینڈ تیج سے آزاد تھا بلکہ رابیل نے بالوں کی لٹ سے اسے چھپا لیا تھا۔شائد وہ نہیں چاہتی تھی بینڈ تیج کی وجہ سے سب کا دھیان اس کی چوٹ پہ جائے اور سوال و جواب کا سیشن شروع ہو یا پھر وہ اذلان کو مزید شرمندہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔صبح بھی وہ اس کی بینڈ تیج دیکھ کر خاصہ شرمندہ نظر آرہا تھا اور رابیل کو تمام دن اس بات کا شدید افسوس رہا تھا کہ اس نے بھی اس کے ساتھ تھوڑی زیادتی کردی۔یقیناً اس نے یہ سب جان بوجھ کر نہیں کیا۔پر اب جو وہ منا رہا تھا تو رابیل کو اس یہ انداز لطف دے رہا تھا۔

''کچھ باتوں میں آپ چاہ کر بھی اختیار نہیں رکھتے۔اسے میری مجبوری سمجھو یا کمزوری۔میں دو چیزوں میں آج بھی کنٹرول لیس ہوں''۔ وہ اب اس کی لٹ کو انگلی پہ لپیٹے گہری سوچ میں تھا جیسے اپنی کیفیت سمجھانے کے لئے لفظوں کی تلاش میں ہو۔

''تمہیں اپنے قریب نہیں آنے دے سکتا۔میں کوشش کررہا ہوں جلد خود پہ قابو پالوں لیکن اب تک ہر کوشش ناکام رہی ہے''۔اس نے رابیل کو سچ بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔اس سے پہلے کہ یہ الجھن ان کی زندگی میں غلط فہمیوں کا آغاز کرے اسے رابیل کو اعتماد میں لینا تھا۔

''جس طرح میں آج تک آپ کو سمجھنے میں ناکام رہی ہوں''۔اپنی حیرت پہ قابو پاتے رابیل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''مجھے سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''یا پھر آپ خود نہیں چاہتے کوئی آپ کو سمجھے؟''

''مجھے سمجھنے کے لئے میری زندگی جینا پڑے گا رابیل اور میری دعا ہے تم پہ ان لمحوں کا سایہ بھی نہ پڑے جس کی بدولت آج میں اس عذاب سے گزر رہا ہوں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''اذلان ہمارا تعلق اتنا کمزور تو نہیں کہ آپ مجھ پہ اعتبار نہ کر سکیں''۔رابیل کا انداز شکوہ لئے تھا۔

''میری بات ابھی ادھوری ہے رابی، تم میری دوسری کمزوری کے متعلق جاننا نہیں چاہتی''۔رابیل نے لب کاٹتے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ تم ہو۔''اذلان نے دائیں ہاتھ سے اس کی تھوڑی کو تھامے رابیل کا چہرہ اونچا کیا۔

''میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں، تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔کیا تمہیں میری بات پہ اعتبار ہے؟''وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا سیدھا دل میں اتر رہا تھا۔

''آپ نہ بھی کہتے تو اعتبار تھا، ایسے ہی تو آپ کا ساتھ نہیں چنا۔ ایک بات یاد رکھیں اذلان میں آپ سے بے حد محبت کرتی ہوں اور

آپ کو تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔میرے لئے آپ کی محبت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے۔جب بھی ہاتھ بڑھائیں گے مجھے اپنے ساتھ پائیں گے"۔رابیل نے اس کا ہاتھ تھامے سنجیدگی سے کہا۔یہ اقرار ہی اذلان کی روح کو سیراب کرنے کے لئے کافی تھا۔

''اس کے لئے ایک بار پھر سوری"۔اس نے نرمی سے اس کے ماتھے لگے کٹ پہ بوسہ دیا تھا۔

☆☆☆

دن ہفتوں میں بدل رہے تھے۔ بظاہر سب ٹھیک تھا سوائے اذلان کے۔ اس کا پل پل بدلتا موڈ رابیل کے لئے دردِ سر بنا ہوا تھا۔سب کے سامنے تو وہ اس سے نارمل بات چیت کرتا اور اکثر اکیلے میں بھی ٹھیک ہی ہوتا لیکن وہ رابیل سے آج بھی اتنے ہی فاصلے پہ تھا جتنا شادی کی پہلی رات۔اذلان کا یہ گریز رابیل کو دن بہ دن ڈپریس کر رہا تھا۔اچانک وہ اسے بے تحاشہ اہمیت دینے لگتا اور اگلے ہی پل اسے بری طرح اگنور کرتا۔کبھی ساری ساری رات کمرے میں نہ آتا اور جب آتا تو بھی وہاں

موجود نہ ہوتا۔رابیل اس کی غیر موجودگی میں جتنی اذیت سہتی اس سے کئی گنا زیادہ تکلیف وہ اس کی موجودگی میں برداشت کرتی جب اس سے پیٹھ موڑے وہ رات گزار دیتا۔آج بھی ایک ویسی ہی رات تھی۔نیند رابیل کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔اس کا ڈپریشن ان دنوں غصے میں بدلنے لگا تھا۔پھر بھی اس نے اذلان سے وعدہ کیا تھا وہ اس کا ساتھ دے گی، اس کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے اس سے کبھی شکایت نہیں کرے گی اور وہ اپنا وعدہ نبھا رہی تھی۔

کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتے وہ بے مقصد سیاہ آسمان کو گھور رہی تھی ساتھ ہی ساتھ اپنی اذلان کی زندگی میں حیثیت اور اہمیت کے متعلق سوچ رہی تھی۔

''ماما پلیز مجھے مت ماریں۔ماما مجھے بہت درد ہورہا ہے''۔اذلان کی آواز پہ چونک کر رابیل نے پیچھے دیکھا۔

''ماما نہیں۔۔۔۔جل رہا ہے۔''اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ دھیمی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔

''ازلان''۔رابیل تیز قدموں سے چلتی اس کے پاس چلی آئی۔

''میں جل رہا ہوں ماما''۔اس کے چہرے پہ کرب تھا۔ سرد رات میں وہ پسینے پسینے ہورہا تھا۔

''ازلان اٹھیں''۔رابیل نے ایکدم گھبرا کر اسے جھنجوڑا۔

''نہیں''۔وہ چلایا۔آنکھیں اب بھی بند تھیں۔شائد وہ خواب دیکھ رہا تھا۔

''ازلان پلیز اٹھیں''۔رابیل نے التجا کی۔

''تم؟''ازلان نے آنکھیں کھولیں اور بے یقینی سے پاس بیٹھی رابیل کو دیکھا جو متفکر چہرے سے اس کی طرف متوجہ تھی۔

''آپ شائد خواب دیکھ رہے تھے''۔وہ اب بھی چت لیٹا خالی نظروں سے اس کی سمت دیکھ رہا۔

''ہاں۔۔۔شائد خواب ہی تھا''۔وہ بے یقینی سے بولا۔

''آپ ٹھیک ہیں؟''رابیل دھیرے دھیرے اس کے نم بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''میں ٹھیک ہوں؟''وہ اس کے سوال پہ متحیر تھی پر کوئی ری ایکٹ نہیں کیا۔

''تم سو جاؤ۔۔۔میں ٹھیک ہوں''۔کچھ پل گزرے اور اذلان کی تیز چلتی سانسیں مدھم ہونے لگیں۔رابیل کا ہاتھ ہٹا کر اس نے اسے اپنے پہلو میں کھینچ لیا۔کہنی کے بل لیٹی رابیل اس کی آنکھوں میں اپنے لئے کوئی جذبہ کھوج رہی تھی۔وہاں اس پل فقط وحشت تھی۔تھکاوٹ تھی۔اضطراب تھا۔

''آپ بھی سونے کی کوشش کریں''۔آنکھیں موندتے رابیل دھیمے لہجے میں بولی۔وہ نہیں جانتی تھی ایسے خواب اذلان کو کئی راتیں سونے نہیں دیتے۔اب بھی اسے جاگ کر صبح کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

کل رات جو کچھ ہوا اس نے رابیل کو صحیح معنوں میں ہلا کر رکھ دیا تھا۔اذلان کے ساتھ یقیناً کوئی مسئلہ تھا۔رابیل نے صاف صریحاً اس کی التجائیں سنی تھیں۔اس کا خوف سے تڑپنا، اس کی بے بسی اور جاگنے کے

بعد وہ وحشت و بے یقینی۔وہ کوئی عام انسان بھی ہوتی تو اس واقعہ کو نظر انداز نہ کرسکتی لیکن وہ ایک ڈاکٹر تھی۔بھلے آج تک بیماری کا علاج کیا تھا پر اذلان کے مرض کا کچھ کچھ اندازہ اسے بھی ہوچکا تھا۔صبح اذلان ہمیشہ کی طرح چاق و چوبند تھا لیکن اس سے کھنچا کھنچا۔اس سے نظریں ملائے بغیر وہ آفس چلا گیا تو رابیل کے لئے سوالات کا انبار چھوڑ گیا۔ایک سرا ہاتھ لگا تھا اسی کے آسرے اسے یہ گتھی سلجھانی تھی۔کچھ سوچ کر وہ اذلان کی اسٹڈی میں چلی آئی۔یونہی الٹ پلٹ کرتے اذلان کی دراز سے ایک فائل نکلی جسے دیکھ کر رابیل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔تو اس کا اندازہ ٹھیک نکلا تھا۔

یہ فائل ڈاکٹر چغتائی کے کلینک کی تھی جس میں اذلان کی چند ماہ پرانی اپائنٹمنٹ کے ساتھ، اینٹی ڈپریسنٹ ادویات کا ایک نسخہ اور ڈاکٹر کا بل موجود تھا۔ڈاکٹر چغتائی شہر کے مشہور ماہرِ نفسیات تھے۔رابیل کے لئے تو ان کا درجہ استاد کا تھا گو وہ ان کی بالواسطہ شاگرد نہ تھی پر ان کی شہرت اور کام سے اچھی طرح واقف تھی۔

دوسری کوئی تفصیل اس فائل میں نہیں تھی۔سراغ ملا بھی تو ادھورا۔پر اسے یہ مسئلہ کسی سے تو شئیر کرنا تھا۔یہی سوچ کر وہ نغمانہ کے پاس چلی آئی۔ڈاکٹر چغتائی کے پائے کی نہ سہی پر نغمانہ بھی ماہرِ نفسیات تھی۔اس کے پاس جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ رابیل کی نا صرف اچھی دوست تھی بلکہ اس کے لئے نہایت قابلِ اعتبار بھی تھی۔

سچ کہوں تو مجھے یہ صاف صاف PTS (Post Traumatic Stress)(صدمے کے بعد کا ذہنی دباؤ) کا کیس لگ رہا ہے"۔ساری بات سننے کے بعد نغمانہ اس نتیجے پہ پہنچی تھی۔

''آر یو شیور؟"رابیل کے لئے یہ انکشاف چونکا دینے والا تھا۔

''تم جو علامات بتا رہی ہو۔اس کا خواب میں ڈرنا، تمہارے ساتھ عجیب و غریب رویہ۔اور پھر ڈاکٹر چغتائی کی اپائنٹمنٹس۔۔یہ سب کچھ ایسی ہی صورتحال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔"نغمانہ نے تفصیلاً بتایا۔

''تمہارا کہنے کا مطلب اذلان نفسیاتی مریض ہے؟"اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا لیکن تمام حقائق اسی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

''تمہیں بھی تو یہی احساس ہوا نا اسی لئے تو تم میرے پاس آئی ہو''۔رابیل نے اثبات میں سر ہلایا۔سمجھ تو وہ بھی گئی تھی پر دل نہیں مان رہا تھا۔

''کبھی کبھی وہ میرے ساتھ بہت اچھے ہوتے ہیں۔اتنے لونگ اور کیئرنگ کہ خود پہ رشک آتا ہے لیکن اگلے ہی پل وہ بالکل اجنبی ہو جاتے ہیں۔ان کے لہجے میں مجھے بے یقینی دکھائی دیتی ہے جیسے انہیں مجھ پہ اعتبار ہی نہیں''۔یہ سب سہنا جتنا مشکل تھا اسے دہرانا اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ۔

''تم خود سوچو ایسا کیوں ہو رہا ہے۔اس نے تم سے اپنی پسند سے شادی کی۔خود تمہاری طرف ہاتھ بڑھایا پھر کیوں اتنا وقت گزرنے کے باوجود وہ تمہارے ساتھ تعلق نہیں بنا سکا''۔ڈاکٹر کی حیثیت سے اس سے نہ مل رہی ہوتی تو اپنا اتنا انتہائی ذاتی مسئلہ کبھی اس سے نہ کہتی۔

''یہی سب کچھ تو میری الجھن بڑھا رہا ہے۔خود سے ہاتھ بڑھا کر جھٹک دیا جائے تو اپنا آپ بڑا حقیر لگتا ہے''۔رابیل نے لب کاٹے۔

''اس بات کو جذباتی ہو کر نہیں سوچو۔اذلان کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہے اور تم تو خود ایک ڈاکٹر ہو۔اس کے مسئلے کا منطقی حل تلاش کرو''۔نغمانہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھتے تسلی دی۔

''تمہیں لگتا ہے ڈاکٹر چغتائی اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں''۔اسے اچانک خیال آیا تھا۔اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے اگر وہ ڈائریکٹ ان تک پہنچ جائے تو سب کچھ کلئیر ہو جائے گا۔

''بالکل نہیں۔ماہرِ نفسیات اپنے مریضوں کی کوئی بات کسی سے بھی شئیر نہیں کرتے۔یہ پروفیشنل ایتھیکس کا معاملہ ہے''۔نغمانہ نے صاف گوئی سے بتایا۔

''تو پھر تم بتاؤ اس بات کا کیا حل ہو سکتا ہے۔میری تو عقل بالکل کام نہیں کر رہی۔خاص طور پہ کل رات سے۔اذلان خواب میں اتنی بری طرح چلا رہے تھے اور اس کے بعد تو میری طرف دیکھ بھی نہیں رہے۔پہلے بھی دو تین بار ایسا ہو چکا ہے وہ اچانک مجھے اگنور کرنا شروع

کر دیتے ہیں"۔وہ شدید پریشان تھی۔ایسا کب تک چلے گا۔اس سے پوچھے بھی تو کیا اور کیسے جو بات بھی نپی تلی کرتا تھا۔

"عام طور پر ایسے مریض بد اعتمادی کا شکار ہوتے ہیں۔انہیں پیار اور اعتماد سے ہی ہینڈل کیا جاسکتا ہے۔ڈائریکٹ پوچھنے پہ تو شائد وہ تمہیں کچھ بھی نہ بتائے الٹا ردِ عمل ہی کرے گا"۔نغمانہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔اگر کچھ بتانا ہوتا تو ازلان پہلے ہی اسے بتا چکا تھا۔

"تم نے کہا وہ بار بار اپنی ماں کا ذکر کر رہا تھا۔تم اپنی ساس سے کیوں بات نہیں کرتی۔ان سے پوچھو نا ان کے بیٹے کو کیا مسئلہ ہے"۔نغمانہ نے ایک نئی راہ سجھائی۔رابیل کے لئے اندھیرے میں جگنو کی طرح اس وقت تو یہی روشنی بہت تھی۔اتنے دن میں پہلی بار اس نے کسی اور سے اپنا مسئلہ بیان کیا تھا۔کچھ نئی باتوں میں ذہن الجھا تو بوجھ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

''کیا بات ہے رابیل تم کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو؟''مسز شاہ گھر میں داخل ہوئیں تو رابیل گم صم سی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔وہ ورکنگ لیڈی تھیں اور خاصی مصروف خاتون۔ایک انٹرنیشنل لیول کی این جی او کی سرپرست تھیں اور ملکی و غیر ملکی بے شمار فلاحی کاموں میں سرگرم۔ ایسے میں گھر سے زیادہ ان کا وقت دوسرے شہروں اور ملکوں میں گزرتا تھا۔جب اذلان کا ایکسیڈنٹ ہوا ان دنوں بھی وہ امریکہ ایک چیرائٹی پروگرام میں گئی ہوئی تھیں۔جیسے انہوں نے کبھی اذلان کی ذاتیات میں مداخلت نہیں کی تھی کچھ اسی طرح اذلان بھی ان کی ایکٹیو لائف میں نہیں گھستا تھا۔

''جی ہاں اینڈ تھینکس ٹو یو۔یہ سب آپ کی بدولت ہے''۔رابیل پہلے ہی چڑی بیٹھی تھی ان کا لاپرواہ سا انداز دیکھ کر مزید جل گئی اور خود کو روک نہیں پائی۔

''یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہو تم مجھ سے''۔وہ اس رویے پہ چونکیں۔

''وہی جو آپ ڈیزرو کرتی ہیں۔''اسے ان سے بات تو کرنی ہی تھی تو ابھی کیوں نہیں۔کل رات سے اس کے کانوں میں اذلان کی التجائیں اس کا کراہنا تازیانے بجا رہا تھا۔وہ گنگ سی رہ گئیں۔

''کیسی ماں ہیں آپ۔بظاہر تو بڑی نفیس اور اونچے خیالات والی لگتی ہیں۔سوشل ورک سے لوگوں کی زندگیوں میں بدلاؤ لانے کا عزم و جنون لیکن اپنے گھر سے بے پرواہ۔''وہ تیز لہجے میں بولی تو مسز شاہ سلگ کر صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

''شٹ اپ۔تم حد سے بڑھ رہی ہو''۔ان کا دماغ گھوم گیا تھا رابیل کی اس بدتمیزی پہ۔

''اور آپ کی حد کیا تھی بیگم آسیہ طیب شاہ۔اپنی اکلوتی اولاد کو ٹارچر کرنا۔اس پہ جسمانی تشدد کرنا۔رابیل نے ہذیانی انداز میں سوال کیا اور ان کا چہرہ پل بھر میں زرد پڑا۔

''اذلان کو خواب میں چلاتے سنا ہے میں نے۔رو رو کر بھیک مانگ رہے تھے وہ مما مجھے مت ماریں۔آپ نے اپنی اولاد کو نفسیاتی مریض بنا

دیا ہے۔کوئی ماں ایسا کیسے کر سکتی ہے اپنے بچے کے ساتھ۔“وہ صوفے پہ گرتی چلی گئیں۔رابیل کہتی رہی۔

”ٹھیک کہا تم نے رابیل کوئی ماں کیسے کرسکتی ہے اتنا برا سلوک اپنی اولاد کے ساتھ۔بلکہ میں تو کہتی ہوں کوئی عورت کسی بھی بچے کے ساتھ اتنا برا سلوک نہیں کرسکتی جو سب اذلان کے ساتھ اس کی سوتیلی ماں کرتی رہی ہے“۔ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”سوتیلی ماں؟“رابیل چونکی۔

”غلطی میری ہی ہے، تمہیں سب کچھ پہلے بتادینا چاہیئے تھا لیکن میں تو یہی سمجھتی رہی شائد اتنے سالوں کے طویل علاج کے بعد اذلان اس ٹراما سے باہر آچکا ہے۔تم سے شادی کے بعد تو مجھے پورا یقین تھا وہ اپنے ماضی سے نکل چکا ہو گا لیکن میں غلط تھی“۔یہ کیسا انکشاف تھا جس نے رابیل کے پیروں تلے کی زمین نکال دی تھی۔

”تو کیا اذلان“۔وہ شرمندہ و حیران تھی۔

’’ہاں رابیل اذلان میری سگی اولاد نہیں ہے۔سر جھکائے دھیمی آواز میں انہوں نے رابیل پہ بم پھوڑا تھا۔

☆☆☆

یہ خزاں کی ایک دھند بھری شام تھی۔ہمایوں کی طبیعت میں بہتری آکر ہی نہیں دیتی تھی۔ڈاکٹر کے مطابق تو اسے کوئی بیماری نہیں تھی پر جسم دن بہ دن ناکارہ ہوتا جارہا تھا۔وہ کم ہی اپنے کمرے سے باہر نکلتا تھا پر آج جی گھبرایا تو ہمت کرکے باہر چلا آیا۔سفیان کے کمرے میں ضوفشاں کی موجودگی کی تصدیق ان دونوں کی آوازوں سے ہوئی تھی۔غصہ بہت چھوٹی چیز تھی۔اس کے اندر آتش فشاں ابل رہا تھا۔دھوکا، تضحیک، ملال۔۔۔۔جانے کتنے ہی جذبے اسے پاگل کر رہے تھے۔اپنی پستول تھامے جنونیوں کی طرح وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ دونوں بے حیائی کی تصویر بنے اس کی ناک کے نیچے اسی کے مال پہ عیاشی کر رہے تھے۔اپنی غلطی کا احساس تو اسے ہو ہی چکا تھا پر شائد اب بہت دیر ہوگئی تھی۔اسے اچانک دیکھ کر وہ دونوں ایک پل کو

چونکے پر اگلے ہی لمحے ڈھٹائی کے سب ریکارڈ توڑ کر ضوفشاں نے جس بے شرمی کا مظاہرہ کیا اس نے خود ہمایوں کا سر شرم سے جھکا دیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا اس فاحشہ کو جان سے مار دے۔ہمایوں نے اندھا دھند گولیاں چلائیں جو سیدھی ضوفشاں کی پسلیوں میں لگیں۔سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ وہ اپنا دفاع نہ کر سکی اور موقع پر ہلاک ہوگئی مگر سفیان نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ہمایوں کے سامنے پول کھلنا اسے بدحواس کرپایا تھا نہ ضوفشاں کی موت نے اس کے اوسان خطا کئے تھے۔ہمایوں کے مقابلے میں تو وہ خوب ہٹا کٹا تھا۔ایک ہی جست میں اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ہمایوں کو مغلظات بکتا وہ سیدھا اذلان کے کمرے میں پہنچا۔بچے نے باپ کو جب سفیان کی گرفت میں دیکھا تو خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔سب کچھ تو کھل چکا تھا۔ ہمایوں کو اب ایک ہی طریقے سے بلیک میل کیا جاسکتا تھا اور وہ اس کا بیٹا تھا۔ سفیان نے کرسی پہ ہمایوں کو باندھا جو پہلے ہی ادھ مواء ہوچکا تھا جبکہ بچہ اب اس کی گرفت میں تھا۔

''میرے بیٹے کو کچھ مت کہنا سفیان، تم جو چاہتے ہو میں تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں''۔پستول اب سفیان کے ہاتھ میں تھا اور آٹھ سالہ اذلان اس کی گرفت میں چلا رہا تھا۔ہمایوں بخت نے التجا کی۔اس کی سانس بری طرح اکھڑ رہی تھی۔

''تمہارے پاس اب کچھ بچا ہی کہاں ہے ہمایوں بخت۔سب کچھ حاصل کرچکا ہوں میں جو مجھے چاہیئے تھا''۔سفیان ہنسا۔

''تو پھر چھوڑ دو اذلان کو۔میری اولاد سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں''۔اس نے ہاتھ جوڑے۔اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی سب سے قیمتی متاع کو تڑپتے دیکھنا بہت بڑا کرب تھا۔

''دشمنی تو تم سے بھی کوئی نہیں تھی میری۔بس تمہاری دولت ہی تمہاری دشمن بن گئی اور اب تمہارے اس پلے کی۔بڑی لمبی چوڑی جائیداد اکٹھی کر رکھی ہے اس کے نام پر تم نے''۔وہ تمسخر سے بولا۔

''کل تک کا وقت دیتا ہوں تمہیں۔مجھے اس ساری پراپرٹی کا انتقال اپنے نام پہ چاہیئے ورنہ اس پلے کا۔۔۔''سفیان نے دھمکی دی۔

''ہو جائے گا۔تم بس میرے بچے کو کچھ مت کہنا''۔ہمایوں بے ساختہ بولا۔

''گڈ۔کل تک ہو جائے تو اچھا ہے کیونکہ اس کے بعد تمہیں اپنی لاڈلی بیوی کے قتل کے الزام میں پھانسی بھی تو چڑھنا ہے''۔پستول کی نالی بچے کی گردن میں چبھوتے اس نے سفاکی سے کہا اور پھر ہمایوں بخت کی کرسی کو ٹھوکر مارتے اذلان کو گھسیٹتا کمرے سے نکل گیا۔پیچھے ہمایوں بخت تڑپتا رہا۔خرابیِ صحت اور حالات دونوں نے ہی اس کی ہمت توڑ دی تھی۔

☆☆☆

انتہائی نگہداشت کے باہر سناٹا چھایا تھا۔سوئی گرنے کی آواز پہ بھی دل دہل جاتا تھا۔پچھلے ایک گھنٹے سے وہ راہداری میں جائے نماز بچھائے بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔دھیان اندر کی طرف جاتا تو دل گرفتگی اور بڑھ جاتی۔زبان پہ ورد دل میں دعا کرتی وہ رنج و الم کی تصویر بنی ہر آنے جانے والے کی توجہ بٹور رہی تھی۔عمر شائد پینتیس کے قریب

تھی۔چہرے پہ بڑھتی عمر سے زیادہ تفکر کی لکیریں نمایاں تھیں۔لباس و انداز سے وہ اچھی وضع دار خاتون لگتی تھی۔بہت حسین نہیں پر سادہ اور معصوم تھی لیکن اس وقت شدید کرب سے دوچار تھی۔کوئی بھی اس پل بتا سکتا تھا اس کا اندر موجود مریض سے بہت قریبی تعلق تھا۔وہ کیا بتاتی اندر بسترِ مرگ پہ پڑے شخص سے اس کی سانسیں جڑی تھیں۔وہ دروازہ تھا جس کے بغیر گھر کا تصور ہی ممکن نہیں۔ڈاکٹر کو سی سی یو سے نکلتے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مسز طیب سب کچھ تو آپ پہلے سے جانتی ہیں۔آپ کے شوہر کا کینسر لاسٹ اسٹیج پہ ہے۔آپریشن کے بعد بھی نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔اب تو بس دعا ہی ہے''۔آسیہ کے سوال پہ ڈاکٹر کا ناامیدی میں ڈوبا جواب آیا تھا۔

''ڈاکٹر ایبک لیکن آپ نے تو کہا تھا آپریشن سے بہتری کا امکان ہے''۔وہ تفکر سے بولی۔

’’جی بالکل میں نے کہا تھا ففٹی ففٹی چانسز ہیں لیکن بائی آپسی کے بعد سے اب تک اس کی جڑیں اس تیزی سے پھیلی ہیں کہ اب اگر میں کچھ بھی کرتا تو اپنے ہاتھوں مریض کو آپریشن ٹیبل پہ ہی ختم کردیتا‘‘۔ڈاکٹر نے پہلی کی کہی بات دہرائی۔آپریشن سے پہلے قوی امید کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس کے شوہر کا آپریشن ناکام ہوا تھا۔کل رات سے اس کی حالت کچھ ایسی بگڑی کہ سی سی یو وارڈ میں داخل کرنا پڑا۔

’’آپ نے امریکن ڈاکٹر اسٹیفن کا ذکر کیا تھا‘‘۔آسیہ طیب شاہ نے امید بھری نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا جو اس شہر کا سب سے مہنگا، سب سے قابل سرجن تصور کیا جاتا تھا۔

’’مسٹر شاہ کی رپورٹس آپ سے پہلے میں انہیں بھیج چکا ہوں۔ جواب وہاں سے بھی وہی آیا ہو پھر بھی اگر آپ چانس لینا چاہیں تو میں آپ کو روکوں گا نہیں۔سچ تو یہ ہے پھیپھڑوں کے کینسر کا علاج پاکستان میں بھی اب جدید طریقے سے ہی کیا جارہا ہے‘‘۔مایوسی شائد مقدر بن چکی تھی۔

''آئی ایم سوری مسز شاہ''۔ڈاکٹر کے پاس اب حرفِ تسلی بھی نہیں تھے۔ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اندر داخل ہوئی جہاں نالیوں میں جکڑے اس کے محبوب شوہر کا وجود ساکت پڑا تھا۔وہ بہت دیر وہاں رک نہ سکی کہ جب بھی اسے دیکھتی زاروقطار رونے لگتی اور اندر موجود اسٹاف اسے باہر بھیج دیتے۔

رات کے ڈھائی بج رہے تھے پر نیند کو آنکھوں سے بغاوت کئے توکئی دن ہوچکے تھے۔آج بھی وہ سی سی یو کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے جائے نماز پہ سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھی اپنی زندگی کا تجزیہ کر رہی تھی۔طیب شاہ کی دس سالہ رفاقت میں اس نے ایک ایک پل آسودہ گزارا تھا۔زندگی کو بھرپور انجوائے کیا تھا۔قدرت نے اسے اولاد کا سکھ نہیں دیا تھا پر طیب شاہ کا ساتھ آسیہ کی اس کمی کو پورا کرگیا تھا۔وہ اچھے متمول گھرانے کا فرد تھا پر اولاد نہ ہونے کے باوجود اس نے دوسری شادی کا سوچا بھی نہیں تھا۔آسیہ کے لئے طیب شاہ زندگی سے بڑھ کر تھا پر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔دو ماہ پہلے طیب شاہ کو

پھیپڑوں کا کینسر تشخیص ہوا۔فوری علاج اور ڈاکٹروں کی تسلی بخش باتوں کے باوجود آپریشن ناکام رہا۔اللہ کی رضا کے آگے انسان ایسے ہی بے بس ہوجاتا ہے جیسے آسیہ طیب شاہ ہوگئ تھی۔وہ تو امریکہ تک علاج کے لئے لے جانے پر راضی تھی لیکن ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ اگلی صبح اس سے بھی زیادہ دردناک تھی جب طیب شاہ کے کومہ میں جانے کی اطلاع آسیہ کی ہلکی سی امید بھی توڑ چکی تھی۔یہ بہتر گھنٹے بہت قیمتی تھے۔

☆☆☆

گلفشاں سے سفیان اسے اپنے ساتھ بندی بنا کر لے کر نکلا تھا۔وہ روتا بلکتا گاڑی میں بیٹھا تھا جبکہ سفیان وقفے وقفے سے اس پہ چیختا چلاتا کبھی دو ہاتھ بھی لگا دیتا۔سفیان کو پتا تھا اذلان کی بدولت بقیہ جائیداد کے کاغذات ہمایوں بخت بہت جلد دے دے گا۔ضوفشاں کے بغیر بھی اس کا پلان شاندار رہا تھا۔اس کی محبت میں ضوفشاں اب اتنی قربانی تو دے سکتی تھی۔اپنی کامیابی پہ نہال ہوتا وہ جوش و خروش سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

اتنی تسلی تھی لاغر ہمایوں بخت اپنی اکلوتی اولاد کی جان کی خاطر کبھی پولیس کو انوالو نہیں کرے گا اور وہ ٹھیک سوچ رہا تھا۔اندھیرے میں تیزی سے موڑ کاٹتے اچانک گاڑی بے قابو ہوئی اور کھائی میں جاگری۔یہ قسمت تھی کہ گاڑی الٹنے پہ ہاتھ پاؤں مارتا اذلان دروازہ کھلنے سے باہر گر پڑا جبکہ اس سے کچھ فاصلے پہ گاڑی سفیان سمیت دھماکے سے جل کر تباہ ہوگئی۔خود اذلان شدید زخمی تھا۔ریسکیو والے حادثے کی جگہ پہنچے تو زخموں سے چور ادھ موئے بچے کی آخری سانسیں چل رہی تھیں۔اسے مقامی اسپتال میں فوری شفٹ کیا گیا۔ڈاکٹروں کے مطابق اس کے بچنے کی امید کم تھی پر جہاں انسان کی سوچ ختم ہوتی ہے وہیں قدرت اپنا آپ منواتی ہے۔

اذلان سے آسیہ طیب شاہ کی پہلی ملاقات سی سی یو میں ہوئی تھی۔وقفے وقفے سے چیختے چلاتے اذلان کی آوازیں آسیہ کا دل دہلا رہی تھیں

''اسٹاف یہ بچہ کس کا ہے۔بہت چیخ چلا رہا ہے''۔آسیہ اپنے شوہر کو دیکھنے اندر آئی تو دھیمی آواز میں اسٹاف نرس سے پوچھ بیٹھی۔

''پتا نہیں جی بیچارہ کار ایکسیڈنٹ میں بڑا ہی بری طرح زخمی ہوا ہے۔اللہ جانے بچے گا بھی یا نہیں''۔نرس تاسف سے بولی۔

''میں ایک نظر دیکھ سکتی ہوں؟''اپنے غم کا احساس ہو تو دوسروں کا دکھ بھی محسوس ہوتا ہے آسیہ اجازت پاکر اس سے ملنے چلی گئی۔بچہ واقعی شدید زخمی تھا۔اس کے جسم پہ جگہ جگہ پٹیاں بندھی تھیں۔اس کا خون بہت بہہ چکا تھا مگر اس سب سے بڑھ کر وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔جب بھی ہوش میں آتا چیختا چلاتا اور کسی کو خود کو ہاتھ نہ لگانے دیتا۔یہی وجہ تھی کہ اسے بچوں کے وارڈ میں رکھنے کی بجائے سی سی یو میں رکھا گیا تھا۔وہ کون تھا کہاں سے آیا تھا اس کے متعلق فی الوقت کوئی نہیں جانتا تھا۔دو روز بعد کوما کی حالت میں طیب شاہ کی موت بجلی بن کر آسیہ پہ گری تھی۔اپنے غم سے نڈھال اسے وہ زخموں سے چور بچہ بھول چکا تھا جو کسی کے بھی ہاتھ لگانے پہ تڑپ کر چیخ و پکار کرتا رو رو کر التجائیں کرتا تھا۔

☆☆☆

آسیہ پچھلے چند سالوں سے ایک مقامی این جی او سے منسلک تھی جن کے شہر میں اولڈ ہاؤس اور یتیم خانے تھے۔شائد یہ اولاد کی کمی کو پورا کرنے کا طریقہ تھا وہ ان یتیم بچوں کے پاس چلی جاتی۔ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنا ان کو تحائف دینا دل کو سکون دیتا تھا۔ان دنوں تنہائی کاٹتی تھی اور تنہا رہنے کا عذاب راتوں کو سونے نہ دیتا تھا۔وہ یتیم خانے چلی آئی جہاں ایک کونے میں گم صم اذلان بیٹھا تھا۔حادثے کے بعد وہ بالکل خاموش تھا یہاں تک کہ پولیس اور ڈاکٹروں کو بھی کچھ نہیں بتاتا تھا۔

تحقیقات اور شواہد کی بدولت پولیس نے اذلان کا تعلق گلفشاں سے جوڑا۔یہ بھی ایک دردناک خبر تھی کہ ہمایوں بخت جانبر نہ ہوسکا۔گھر میں اس کی لاش ضوفشاں کے ساتھ پائی گئی۔آسیہ نے اس سے بات چیت کی کوشش کی لیکن وہ اس کی توجہ حاصل نہ کرسکی۔اذلان سے اسے ہمدردی ہوئی تھی۔اس نے اذلان کو گود لے لیا۔۔آسیہ کا خیال تھا پیار اور توجہ سے اذلان کے رویے میں بہتری آئے گی پر یہ اس کی سوچ تھی۔وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا جو سالوں کے علاج اور اس کی پیار و

توجہ کے بعد بس اتنا ہی نارمل ہوا کہ بات چیت کرنے لگا۔پڑھائی کرنے لگا۔وہ اب بھی کسی سے گھلتا ملتا نہ تھا نہ ہی کسی کو خود کو چھونے دیتا تھا۔

وہ ان کی زندگی کا اہم حصہ بن چکا تھا اور آسیہ کی توجہ اور محبت نے بہرحال اسے کافی حد تک بدلا۔اذلان ایک بڑی جائیداد کا مالک تھا۔اسی جائیداد کی بدولت اس کے دور کے چند رشتے داروں نے اس کی کسٹڈی فائل کی مگر آسہ کی بے لوث محبت کے باعث عدالت کو اذلان کی کسٹڈی آسیہ کو سونپنی پڑی کیونکہ ایسا خود اذلان چاہتا تھا۔عدالت اس کا ماہانہ خرچہ اس کی بلوغت تک ہر ماہ آسیہ کو دیتی رہی جبکہ اس کی جائیداد چند سال بعد اس کے بالغ ہونے پر اسے سونپ دی گئی پر اسے اس جائیداد میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔اس نے ایک بڑا حصہ آسیہ کی این جی او کو چیراٹی کر دیا۔

ماضی آج بھی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔اس کے خواب آج بھی اسے اذیت دیتے تھے۔

☆☆☆

رابیل کو اپنے ہر سوال کا جواب مل چکا تھا۔اذلان کا سچ رابیل تک بڑے تکلیف دہ انداز میں پہنچا تھا۔آسیہ طیب شاہ کی آنکھیں نم تھیں۔رابیل نے ان سے معذرت کرنے کے بعد انہیں تسلی دی۔یہ یقین دلایا کہ وہ اذلان کو ان تکلیف دہ لمحوں سے نکال لے گی جو آج تک اس کے درد کا باعث ہیں لیکن وہ خود بہت الجھ گئی تھی۔اسے اب اندازہ ہوا ایمر جنسی میں پہلی بار اذلان نے اتنی شدت سے ردِعمل کیوں کیا تھا۔یقیناً وہ اس وقت ایک بار پھر وہی تکلیف محسوس کررہا ہوگا جو سالوں پہلے اس پرانے ایکسیڈنٹ کے وقت محسوس کی تھی۔برسوں کے علاج نے اگر اذلان کو تکلیف اور خوف سے نہیں نکالا تھا تو پھر رابیل تنہا اپنی محبت کے آسرے کیا کر سکتی تھی۔لیکن نہیں محبت میں بہت طاقت ہوتی ہے جو بے یقینی کو یقین میں بدلنے کی قوت رکھتی ہے۔

سچ جان کر وہ اور بھی الجھ گئی تھی۔دل اتنا گھبرایا کہ گھر چلی آئی۔یہ فطرت ہے انسان پریشانی کے لمحوں میں ماں باپ کی طرف نگاہ اٹھاتا

ہے۔ان کی آواز باعثِ سکون ہوتی ہے۔ان کے پاس بیٹھ کر اطمینان ملتا ہے۔جو حالات چل رہے تھے تو رابیل بڑے صبر سے بیٹھی تھی کہ ازلان سے شادی کا فیصلہ سراسر اس کا ذاتی تھا۔نہ بھی ہوتا تو اپنے گھر والوں کو کچھ بتا کر انہیں پریشان کرنا اسے منظور نہ تھا۔کچھ دیر ماما بابا کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔اس کا آج رات یہیں رہنے کا ارادہ تھا۔اپنی طرف سے تو اس نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ اپنے والدین کو اپنی پریشانی کی بھنک نہ پڑنے دے لیکن سکندر حسین سے کچھ بھی چھپانا رابیل کے ہاتھ میں نہیں تھا۔وہ اس کے پیچھے ہی کمرے میں آگئے۔تھوڑی دیر ہنسی مذاق چلتا تھا اور وہ بڑے ضبط سے ان کے ساتھ ہنستی رہی۔

''تم خوش ہو؟'' ہلکی پھلکی باتوں کے بعد اچانک انہوں نے رابیل سے سوال کیا۔

''خوش ہوں''۔اس نے نظریں چرائیں۔وہ جانچتی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''ایسا لگتا ہے تقدیر سے کچھ زیادہ کی خواہش کرلی ہے۔جتنا مل گیا ہے اسے سنبھالنے کے لئے دامن چھوٹا پڑ رہا ہے''۔سکندر حسین مستقل اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔اپنی بات کے اختتام پر رابیل نے سر اٹھایا۔لاکھ کوشش کے باوجود وہ اپنی آنکھوں کی نمی کو روک نہیں پائی تھی۔

''میں تمہیں اتنا بزدل نہیں سمجھتا تھا''۔سکندر حسین نے دوسرا سوال نہیں کیا تھا۔

''میں بزدل نہیں ہوں بس پریشان ہوں۔پتا نہیں کیوں مجھے ہارنے سے خوف آرہا ہے''۔آنسوؤں کو پلکوں پہ سمیٹتے اس نے لب بھینچے۔

''یعنی تم رشتوں کو مقابلہ سمجھتی ہو''۔اتنا تو اسے یقین تھا سکندر حسین اس سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔انہوں نے ہمیشہ اولاد کو اپنی جنگ خود لڑنے کی سیکھ دی تھی۔

''مجھے ایک بات کی بالکل سمجھ نہیں آرہی۔ہم جسے چاہتے ہیں جس کی پرواہ کرتے ہیں اسے یہ یقین کیسے دلایا جائے۔''وہ انہیں کچھ بتا نہیں سکتی تھی پر اپنی الجھن تو شئیر کر سکتی تھی۔

''ظاہر ہے الفاظ اور رویے دونوں طرح سے''۔سکندر حسین نے فی الفور جواب دیا۔

''تو کیا صبح شام اس بات کا ورد کرنے سے سامنے والا ہماری بات کا یقین کرلے گا۔بیزار نہیں ہوجائے گا؟''۔رابیل کے ذہن میں نغمانہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔اسے اذلان کا اعتماد حاصل کرنا تھا۔اس کے مطابق محبت اعتماد کا دوسرا نام ہے۔اذلان اس سے محبت کرتا تھا تو اس کی محبت کا یقین کیوں نہیں کرتا تھا۔

''میرا خیال ہے نہیں۔۔۔لفظ بہت اہم ہوتے ہیں۔فقط رویہ کافی نہیں ہوتا۔دل کی بات زبان پہ لانا پڑتی ہے۔اعتراف کرنا پڑتا ہے۔کیونکہ یہ اچھا لگتا ہے''۔وہ خاموش بیٹھی ان کا منہ دیکھتی رہی۔

''نہیں سمجھی''۔سکندر حسین کے سوال پہ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''دیکھو جب تم چھوٹی تھی نا تو چاکلیٹ بہت شوق سے کھاتی تھی اور تمہاری ماما کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی۔پھر جب میں ان سے چھپ کر تمہیں روزانہ ایک چاکلیٹ لا کر دیتا تو تم آئی لو یو بابا کہہ کر میرے گلے جاتی۔جانتی ہو تم سے یہ اظہار سننے کے لئے ہی میں روزانہ وہ چاکلیٹ تمہیں لاکر دیتا تھا''۔وہ بتاتے گئے رابیل کے چہرے پہ مسکراہٹ ابھری۔

''اولاد اور والدین کو محبتوں کے اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ان کے درمیان یہ عنصر فطرت کا پیدا کردہ ہے پھر بھی یہ اعتراف دل کو خوشی دیتا ہے''۔ہمیشہ کی طرح انہوں نے رابیل کو عام سی بات سے بڑا سبق دیا تھا۔وہ سمجھ گئی تھی اسے اپنے رشتے کو جیتنے کے لئے محبت کا راستہ اختیار کرنا تھا۔خاموش رہ کر تماشہ نہیں دیکھنا تھا آگے بڑھ کر اذلان کی زندگی میں اپنا آپ منوانا تھا۔

☆☆☆

رابیل اگلے دن بھی گھر نہ لوٹی۔یہ اذلان کی برداشت کی حد تھی۔اتنے دن اپنے جنون سے لڑتے وہ رابیل کی اندرونی کیفیت سے بے خبر نہیں تھا۔جانتا تھا وہ بے چین ہے، پریشان ہے لیکن اسے تسلی یا دلاسہ تو دور وہ تو اس سے نظریں ملانے کی جرات بھی نہیں رکھتا تھا۔اسے خود پہ اختیار نہ تھا۔خوف تھا کہ جان نہیں چھوڑتا تھا۔بے یقینی کے منڈلاتے سائے اس کے خواب ان دنوں پہلے سے شدید ہوتے جارہے تھے۔وہ خود سے لڑتا تھک چکا تھا۔پسپائی اختیار کرتا پر ہمت جواب دے جاتی۔ ایسے میں رابیل کا گھر سے بنا بتائے چلے جانا اسے پاگل کر گیا تھا۔کئی بار چاہا کہ اسے کال کرے پر یہ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا کہ کس حق سے واپس بلائے۔اسے دیا ہی کیا تھا آخر اس نے۔ڈپریشن اتنا شدید تھا کہ وہ ان دنوں آفس بھی نہیں جارہا تھا۔اسے لگا شائد وہ اسے ہمیشہ کے لئے کھوچکا ہے لیکن اچانک اسے سامنے دیکھ کر وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکا تھا۔

''رابی پلیز مجھے کبھی چھوڑ کر مت جانا''۔دو راتیں اس نے کمرے کی تنہائی میں وحشت سے جاگ کہ کاٹیں۔اس کے بغیر زندگی کا تصور ہی مار ڈالتا تھا۔

''میں آپ کو کیوں چھوڑ وں گی اذلان اور کس لئے چھوڑوں گی۔ آپ جانتے ہیں میں آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں''۔رابیل اس نیت سے کہا گئی تھی۔وہ تو بس اپنی الجھنوں میں کچھ وقت اکیلے رہ کر سوچنا چاہتی تھی۔یہ دو دن اس نے اذلان کی کیفیت کو سمجھنے اور اس پہ ریسرچ کرنے میں گزارے۔اس دوران اذلان نے ایک بار بھی اسے کال نہ کی تو اسے شدید تکلیف ہوئی۔کیا وہ اسے اتنی سی بھی اہمیت نہیں دیتا تھا لیکن اب اذلان کی بے تابی نے اسے خوشگوار حیرت میں مبتلا کیا تھا۔

''پتا نہیں کیوں لیکن مجھے بڑا خوف آرہا ہے''۔بے اختیار اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔فاصلے بھی اسی نے بنائے تھے۔ان فاصلوں کو کم بھی وہی کر رہا تھا۔

''اپنے نام کا مطلب جانتے ہیں۔اذلان کا مطلب ہوتا ہے شیر۔۔۔اور شیر بادشاہ ہوتا ہے۔وہ کسی سے خوف نہیں کھاتا بلکہ سب اس کی طاقت سے ڈرتے ہیں''۔اس کے سینے سے سر اٹھائے رابیل نے اذلان کی طرف دیکھا جہاں درد کے سایے لہرا رہے تھے۔

''میرا خوف تم ہو رابیل۔شادی کے بعد تمہیں کبھی وہ مقام نہیں دے سکا جس کی تم حقدار تھی۔ہمیشہ تمہیں خود سے پرے دھکیلتا رہا ہوں پر یقین جانو میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں۔ڈرتا ہوں تم مجھ سے بیزار نہ ہوجاؤ''۔اذلان کے بازوؤں کی گرفت کچھ اور سخت ہوئی پر یہ باعثِ تکلیف نہ تھی بلکہ اس شکنجے میں راحت تھی۔

''بیزار انسان نہیں رویے کرتے ہیں۔یہ سچ ہے میں آپ کے رویے میں الجھ کر پچھلے دنوں بہت پریشان رہی ہوں۔ایک مضبوط رشتہ ہونے کے باوجود ہم دریا کے دو کناروں کی طرح چلتے جارہے ہیں۔ساتھ تو ہیں مگر پاس نہیں لیکن یہ سوچ دل سے نکال دیں کہ ہم کبھی جدا ہوں گے۔''وہ اس سے بات کر رہا تھا یہی بہت تھا۔اس طرح رابیل کو

بھی اپنی بات کہنے کا حوصلہ ہوا تھا ورنہ اتنے دنوں سے تو فقط خاموشی تھی جس نے زندگی کو بوجھل کر رکھا تھا۔

''تم میری پریشانیوں کو نہیں سمجھتی رابی۔مجھے کچھ وقت دینا کہ تمہارا ہر شکوہ مٹا سکوں''۔اسے دھیرے سے جدا کرتا وہ بیڈ پہ جا بیٹھا اور سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''پہلے واقعی نہیں سمجھتی تھی پر اب سب کچھ جان چکی ہوں۔آپ سے بس یہی گلہ ہے مجھے یہ سب آپ نے نہیں بتایا۔''رابیل اس کے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔اس کا بازو تھامتے دھیمے لفظوں میں کہا تو اذلان نے بے یقینی سے اس کی سمت دیکھا۔

''میں ڈرتا تھا رابیل سچ جان کر کہیں تم مجھے چھوڑ نہ دو''۔اس نے بے بسی سے اعتراف کیا۔

''یہ خوف اپنے دل سے نکال دیں کہ میں آپ کے ماضی کی وجہ سے آپ کو چھوڑ کر جاؤں گی۔آپ سے محبت کرتی ہوں اذلان اور محبت نہ کمزور ہوتی ہے نہ بے اعتبار''۔رابیل نے پختہ لہجے میں کہا۔

''برسوں سے وہ بھیانک منظر میرے خوابوں کا حصہ ہیں۔پاپا کی بے بسی، میری اذیت۔۔۔کچھ بھی نہیں بھولتا''۔وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

''بھولنا ہو گا اذلان۔۔۔میری خاطر، میری محبت کی خاطر۔ہماری خاطر''۔رابیل اب پرانے درد کا قصہ دہرا کر اسے مزید تکلیف سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''میں کوشش کروں گا رابی۔میں وعدہ کرتا ہوں دوبارہ کبھی ان لمحوں کو نہیں سوچوں گا جو ہماری زندگی میں تلخی کا باعث بنیں''۔اس کا ہاتھ تھامے اذلان نے یقین دلایا۔

''ایک وعدہ اور کرنا ہو گا؟''

''وہ کیا؟''

''نہ تو مجھ سے بدگمان ہوں گے اور نہ مجھ سے محبت کرنا کم کریں گے''۔وہ مسکرایا۔

''مر تو سکتا ہوں لیکن تم سے محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتا رابیل۔تم میری زندگی میں روشنی کی کرن بن کر آئی ہو۔دور جاتی ہو تو وجود

اندھیروں مین ڈوبنے لگتا ہے"۔اس کے دودھیا گالوں کو چھوتے اذلان نے اپنے دل کا حال اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

' ' اندھیرا چھٹ گیا ہے۔نگاہ اٹھا کر دیکھیں کتنی روشن صبح ہے۔ اجلی اور پاکیزہ۔۔۔ہماری زندگی کی نئ شروعات بھی کچھ ایسی ہی ہونی چاہیئے"۔کھڑکی سے چھن کر آتی سورج کی کرنیں رابیل کے چہرے پہ سات رنگ بکھیر رہی تھیں۔مسکرا کر اذلان نے اس کے ماتھے پہ نرم بوسہ دیا اور سینے سے لگالیا۔

☆☆☆

سیاہ کار ڈرائیو وے پہ آکر رکی تھی۔ڈرائیور نے چستی سے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا تھا۔اپنا ہینڈ بیگ تھامے وہ سستی سے گاڑی سے اتری تھی۔ سیاہ سینڈل میں مقید اپنے دودھیا پاؤں سے چھوٹے چھوٹے محتاط قدم اٹھاتی وہ گھر میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ لان سے آتی چند مانوس آوازوں پہ چونک کر اس نے بے اختیار قدم لان کی طرف بڑھا دیئے۔

بہار کے اولین دنوں میں اب سہ پہر میں بہت زیادہ خنکی نہ تھی۔ سورج پوری آب و تاب سے روشن تھا اور وہ اپنی مارننگ شفٹ مکمل کرکے تھکی ہاری گھر لوٹی تھی۔پتھریلی پگڈنڈی سے ہوکر وہ لان کے اس حصے کی طرف چلی گئی جہاں سے ان دونوں کی آوازیں آرہی تھیں اور وہاں پہنچ کر اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

''کیا ہورہاہے یہ سب؟'' دونوں ہاتھ کمر پہ ٹکائے اس نے خفگی سے پوچھا تھا۔

''ماما ہم ٹری(درخت) لگا رہے ہیں''۔تین سالہ آریان کے دونوں ہاتھ گیلی مٹی میں لتھڑے تھے۔کپڑے بھی اس نے اسی حساب سے میلے کچیلے کر رکھے تھے۔بے اختیار اس نے ہاتھ سر پہ مارا۔

''آپ اسے روکنے کی بجائے خود بھی بچے بنے ہوئے ہیں''۔اس نے شکوہ کیا تھا۔اذلان نے مسکراتے ہوئے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر آریان کی مدد کرنے لگا جو ایک ننھا سا پودا لان میں لگا کر اب اسے شاور کین سے پانی دے رہا تھا۔

''تم بھول رہی ہو یہ تمہاری طرح میری کم ہی سنتا ہے''۔اس نے پہلے اپنے بیٹے کے ہاتھ دھلائے پھر خود ہاتھ اچھی طرح دھوتا بیلچہ اور شاور کین وہیں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''اسے بگاڑا کس نے ہے''۔رابیل نے منہ بناتے نیچے جھک کر آریان کی کمر پہ ہلکی سی دھپ لگائی اور پھر آگے بڑھ اس کے نرم سفید گال پہ بوسہ دیا جو دھوپ کی تیزی سے سرخ ہورہے تھے۔وہ ننھے قدموں سے دوڑتا گھر کے اندر چلا گیا تھا۔رابیل جانتی تھی وہ اب اگلا آدھا گھنٹہ باتھ ٹب میں گزارنے والا ہے۔

آئے دن اسے کوئی نا کوئی نیا شوق سوار رہتا تھا۔ان دنوں اس کا کریز باغبانی تھا جو اس عمر کے بچوں کے مطابق ہرگز نہیں تھا لیکن لان میں مالی کو کام کرتے دیکھ کر اسے بھی اپنے ہاتھ سے پودے لگانے کا شوق ہوا تھا۔روز مالی کوئی نیا پودا لے آتا جو آریان کے ہاتھوں لگوایا جاتا۔ اذلان بھی اکثر سب کام چھوڑ کر بیٹے کے شغل میں شامل ہوجاتا۔

''ظاہر سی بات ہے میں نے۔۔۔۔جیسے تمہیں بگاڑا تھا''۔ازلان نے پیچھے سے آکر اس کی کمر کے گرد اپنا بازو حمائل کیا۔

''آپ کی کون سی بات نہیں مانتی میں''؟وہ دونوں اب پتھریلی پگڈنڈی پہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

''کب سے کہہ رہا ہوں چھوڑ دو یہ جاب، خوامخواہ اپنے آپ کو تھکاتی رہتی ہو''۔وہ خوشگوار موڈ میں بولا۔

''ازلان میں ایک ڈاکٹر ہوں، یہ میرا کام ہی نہیں میرا پیشن ہے۔ گھر بیٹھ کر کیا کروں گی؟''رابیل چلتے چلتے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

''میں ہوں نا مریضِ عشق ، میرا علاج کرنا''۔اس نے شرارت سے رابیل کے کان کے پاس سرگوشی کی۔

''میرے خیال میں میرے علاج سے آپ کا کیس بگڑ گیا ہے۔ آپ کسی دوسرے ڈاکٹر سے کنسلٹ کیوں نہیں کرتے؟'' اس کی پولو شرٹ کا کالر ٹھیک کرتے رابیل نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے کہا تھا۔

''عشق اور علاج میں توحید کا قائل ہوں میں۔بار بار ڈاکٹر بدلنا افورڈ نہیں کرسکتا''۔وہ بے ساختہ کہتا اس بار رابیل کو مسکرانے پہ مجبور کر گیا تھا۔

''کیا بات ہے جناب آج بڑے رومانٹک موڈ میں ہیں۔خیر تو ہے ''۔اذلان نے اسے کندھوں سے تھام کر اس کا رخ موڑا۔وہ اب اس کی پشت پہ کھڑا تھا۔جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک ساٹن باکس نکالا۔اندر ایک ڈائمنڈ پینڈنٹ وائٹ گولڈ چین کے ساتھ تھا۔

''کل آپ کی قید میں پورے پانچ سال ہوجائیں گے''۔رابیل کے گلے میں پہناتے اس نے اس کی گردن کی پشت کو ہونٹوں سے چھوا تھا۔

''وہ تو کل ہوں گے نا، یہ تحفہ اتنی جلدی کس خوشی میں دیا جارہا ہے''۔پینڈنٹ کو انگلی سے چھو کر اس نے چہرہ موڑ کر اذلان کی طرف دیکھا تھا۔

''رات کی فلائٹ ہے میری ، ایک ویک کے لئے یو ایس جا رہا ہوں۔اینورسری ڈنر واپسی تک ادھار رہا''۔وہ اب سمجھی تھی اذلان آج جلدی گھر کیسے چلا آیا تھا۔ورنہ تو اس کی واپسی ہمیشہ شام کو ہوتی تھی۔

''ایک تو آپ کے پلانز بھیon the spot ہوتے ہیں۔کال کرکے بتا نہیں سکتے تھے مجھے''۔وہ ایک دم اداس ہوگئ تھی۔

''فون پہ بتا دیتا تو تمہارے چہرے پہ اداسی کا یہ رنگ کیسے دیکھ پاتا''۔اس نے رابیل کے گال کو نرمی سے چھوا۔

''یعنی میری اداسی خوشی دیتی ہے''۔وہ خفگی سے بولی۔

''اونہوں۔۔۔اس اداسی کی وجہ سکون دیتی ہے۔اچھا لگتا ہے جب تم مجھ سے دوری کا سوچ کر پریشان ہوتی ہے''۔اپنا ہاتھ اس کے کندھے پہ حمائل کئے وہ اب اس کے ساتھ چلتا لان کی دوسری جانب نکل گیا تھا۔

''بی کاز آئی لو یو اینڈ آئی رئیلی مس یو''۔سبز گھاس کے تختوں کے گرد سر اٹھائے موسمی پھول قطار در قطار کھلے بہار کا پیغام دے رہے

تھے۔کچھ عرصہ پہلے یہ بہار ان دونوں کی زندگی میں بھی دبے قدموں داخل ہوئی تھی۔بے یقینی اور اذیت کے اس سفر کا خاتمہ ہوا تھا جو سالوں سے اذلان کی روح کو جکڑے ہوئے تھا۔

شروع کا کچھ عرصہ رابیل کے لئے کسی امتحان نہ تھا لیکن یہ اذلان کی محبت تھی جو وہ مایوس ہوئی تھی نہ اس نے ہمت ہاری تھی۔وہ عورت کے ظلم کا شکار، خوف اور جسمانی تکلیف سے لڑتا بے یقینی کی جس منزل پہ کھڑا تھا وہاں سے اسے رابیل ہی واپس لاسکتی تھی کیونکہ ایک وہی تھی جس پہ اذلان خود سے زیادہ اعتبار کرتا تھا۔اس کی محبت اور یقین کا رابیل نے بھرم رکھا تھا۔اپنی وفاداری اور محبت سے اذلان کی زندگی میں جگہ بنائی تھی۔وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے اس یقین دہانی کی ضرورت آج بھی رابیل کو وقتاً فوقتاً پڑتی تھی۔وہ جانتی تھی یہ اقرار اذلان کے دل کی گرہیں کھولنے میں کتنا مددگار ہے۔اس کے بغیر کبھی کبھی وہ بدگمانی کے دریا میں غوطے کھانے لگتا تھا۔رابیل اسے بڑی مشقت سے

وہاں سے نکال کر لائی تھی جبکہ باقی کا کام آریان کی پیدائش نے آسان کر دیا تھا۔

رابیل اور آریان، اپنی کل کائنات کے ساتھ آج اذلان بخت اپنے بخت کا سکندر تھا۔وہ اس دنیا کا سب سے پرسکون اور خوش انسان تھا جس کی زندگی کا مدار اس کی جان سے پیاری بیوی اور لاڈلا بچہ تھا۔

اختتام